رہائی

جمیلہ ہاشمی

اردو رائٹرس گلڈ الہ آباد

رومی

اعلامیہ

اردو رائٹرس گلڈ ایک علمی، ادبی اور ثقافتی ادارہ ہے۔ سچائی، ایمانداری، بے غرضی، امید و یقین اور مسلسل محنت اس کی روح ہے کتابوں کی اشاعت یا فروختگی کا مقصد ذاتی مفاد اور روپیہ کمانا نہیں بل کہ ادیبوں اور قاریوں کے میان مفاہمت اور اشتراک و عمل کی فضا ہموار کرنا ہے تاکہ آیندہ ایک "قومی ادارے" کی تشکیل ممکن ہو سکے۔

ساحل احمد

سکریٹری: اردو رائٹرس گلڈ۔ الٰہ آباد

روہی

جمیلہ ہاشمی

اردو رائٹرس گلڈ - الہ آباد

قیمت :	۱۲ روپے
طابع :	تاج آفسٹ پریس الہ آباد
تعداد :	ایک ہزار
اشاعت :	۱۹۸۰

ناشر : اردو رائٹرس گلڈ۔ الہ آباد

ناولٹ کا مسئلہ : وزیر آغا

دوہی : جمیلہ ہاشمی

صنف ادب میں شاید ناولٹ وہ واحد صنف ادب ہے جس کے بارے
میں آج کے علمی اور ادبی حلقے ایک گومگو کے عالم میں مبتلا ہیں۔ بعض حلقے ناولٹ
کی تعریف اس طرح کرتے ہیں کہ ناولٹ اور طویل مختصر افسانے میں ایک حدِ فاصل
قائم کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ بعض دوسرے حلقے ناولٹ کے اجزائے ترکیبی کے
بیان میں ناول کی ممتاز خصوصیات ہی پیش نظر رکھتے ہیں اور یوں ناول اور ناولٹ
کو گڈمڈ کر دیتے ہیں۔ ایک حلقہ ناولٹ کے وجود سے ہی منکر ہے اور اسے ایک
علیحدہ صنف ادب تسلیم کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس کرتا ہے۔ زیر نظر مضمون کا
مقصد ناول اور افسانے میں ایک حدِ فاصل قائم کرنا ہے تاکہ اس پس منظر میں
ناولٹ کے وجود یا عدم وجود کے بارے میں کچھ باتیں کہی جا سکیں۔

بادی النظر میں ناول اور افسانے کا فرق ضخامت یا حجم سے واضح ہوتا ہے یعنی
جہاں ناول کی طوالت اس بات کی مقتضی ہے کہ اس کے مطالعے کے لیے طویل فرصت کا
اہتمام کیا جائے وہاں افسانہ اپنے اختصار کے باعث محض ایک ہی نشست کا طالب

ہے۔ تاہم یہ فرق ناول اور افسانے میں ایک حدِ فاصل قائم کرنے کے سلسلے میں
کچھ زیادہ ممد نہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ بعض اوقات افسانہ اس قدر طویل ہوتا
ہے کہ اس کا پیکر ایک چھوٹے ناول سے مختلف نظر نہیں آتا۔ اس طرح بعض اوقات
ناول کا میدان محدود ہوتا ہے اور اس کی ضخامت پر طویل مختصر افسانے کا گمان
ہونے لگتا ہے۔ فی الواقعہ ناول اور افسانے کا فرق ان کی ہیئت کے بہ نسبت
ان کے مزاج کے تجزیاتی مطالعہ ہی سے واضح ہوسکتا ہے ناول اور افسانے میں
پہلا اہم فرق کینوس (CANVAS) کی حدود سے پیدا ہوتا ہے۔ ناول کا کینوس اس
قدر وسیع ہوتا ہے کہ اس میں کسی عہد کا تہذیبی ارتقا منعکس دکھائی دیتا ہے جس طرح
کسی عہد کی تاریخ اس عہد کے تمام اہم واقعات کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے بعینہ
کسی عہد کا ناول اپنے زمانے کی مجلسی، سماجی اور تہذیبی اقدار کی نقاب کشائی کرتا ہے۔
اس فرق کے ساتھ کہ جہاں تاریخ محض حقائق کے بیان تک ہی خود کو محدود رکھتی ہے
وہاں ناول ان حقائق کے بجائے تہذیبی رجحانات اور سماجی تحریکات کو شخصی سطح پر
پرکھتا اور کردار، پلاٹ اور منظر کی مدد سے جیتی جاگتی، مچلتی اور دھڑکتی ہوئی زندگی کی
عکاسی کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے عظیم مقصد کے لیے (جب کہ پیش کش کے لیے فنی
لوازم کو ملحوظ رکھنا بھی ضروری ہو) ایک وسیع کینوس کی بھی ضرورت ہے چنانچہ ناول
کے دامن میں درجنوں کردار مختلف واقعات اور تحریکات سے نبرد آزما ہوتے اور ایک
دوسرے سے متصادم ہو کر اپنے نوکیلے کناروں کو واضح کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس
کے علاوہ ناول اس وسیع پس منظر کو بھی اجاگر کرتا ہے۔ جس کی روشنی ان کرداروں

کی ہیئت کو نمایاں کرتی اور انھیں ایک خاص سوشل نظام میں مناسب واقعات پر فائز کرتی ہے۔ ناول کے مقابلے میں افسانے کا کینوس محدود ہے اور یہ زندگی کے صرف ایک رخ اور واقعے یا کردار کے صرف ایک پہلو کو اجاگر کرتا ہے۔ یہی بات ایک مثال سے واضح کرنی ہو تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگر ایک کمرے کو زندگی کا بدل قرار دے لیا جائے تو ناول اسے اجاگر کرنے کے لیے بجلی کے سوئچ کو دباتا ہے اور سارے کمرے میں روشنی پھیلا دیتا ہے ـــــ اس طور کہ کمرے کا ہر گوشہ منور ہو جاتا ہے اس کے برعکس افسانہ ایک ٹارچ کی مدد سے کمرے کے صرف ایک گوشے کو منور کرتا ہے۔ اس طرح کہ کمرے کے دوسرے گوشے تاریکی سے ہم کنار نظروں سے اوجھل رہتے ہیں۔ اس مثال سے افسانے کی تنقیص ہرگز مقصود نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جب افسانہ ایک نسبتاً مختصر سے میدان کے باوجود ایک شدید تاثر کو جنم دیتا ہے تو لامحالہ ایک بہتر فنی نظم و ضبط کا ثبوت بھی بہم پہنچاتا ہے چنانچہ ناول ایک حد تک منتشر صنف ادب ہے وہاں افسانے کی تراش، ہیئت اور تار و پود میں کفایت اور انضباط کا احساس ہوتا ہے مگر اس کا تذکرہ بعد میں کیا جائے گا۔

افسانے اور ناول کا دوسرا اہم فرق کردار کی پیش کش سے پیدا ہوتا ہے بالعموم افسانے میں کردار کے کسی ایک پہلو یا رجحان کو پیش کیا جاتا ہے اور مختلف واقعات کی مدد سے صرف اسی ایک پہلو یا رجحان کو نمایاں کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ دوسرے چونکہ کردار کا یہ پہلو یا رجحان ایک محدود وقت میں توانا ہوتا ہے اس لئے بالعموم افسانہ وقت کے ایک خاص لمحے اور زندگی کے خاص دور ہی سے متعلق نظر آتا ہے۔ بے شک

بعض افسانے کردار کی ساری زندگی پر محیط ہوتے ہیں تاہم اس زندگی کی پیش کش
میں افسانہ نگار انھیں واقعات اور تحریکات کا انتخاب کرتا ہے جو کردار ایک خاص
پہلو کو نمایاں کریں۔ کردار کو اس کے تمام تر پہلوؤں کے اجاگر کرنے کے لئے یہ ضروری ہے
کہ اسے خارجی زندگی کی وسعتوں میں ایک خاص مقام ودیعت کیا جائے اور اس
مقام سے ان روابط کو ملحوظ رکھا جائے جو اسی کردار اور اسی کے ارد گرد پھیلے ہوئے
دوسرے کرداروں کے مابین استوار ہوتے ہیں۔ یہ کام ناول کی نسبتاً کشادہ فضا میں ہی
ممکن ہے یہی وجہ ہے کہ افسانے میں کردار کے ایک پہلو کو بیشتر اوقات بڑے فنی لوازم
کے ساتھ پیش کیا گیا ہے لیکن ایک مکمل کردار ۔ اپنے تمام تر پہلوؤں اور روابط کے ساتھ
ناول ہی میں ابھرا ہے۔ اردو ادب میں کرشن چندر کی مثال لیجئے ان کے افسانوں میں
سینکڑوں کردار بکھرے پڑے ہیں جو ایک لمحے کے لیے سامنے آتے ہیں اور اپنی ایک خاص
ادا، ایک خاص پہلو کو نمایاں کرکے رخصت ہو جاتے ہیں بیشک ناظر اس پہلو سے بے حد
متاثر ہوتا ہے اور یہ تاثر ایک مدت مدید تک اس کے دل کی گہرائیوں میں زندہ رہتا ہے
تاہم یہ کردار ایسے بھرپور انداز سے نہیں ابھرتے کہ ناظر کے ذہن پر چھا جائیں اور ناقابل
فراموش ثابت ہوں چنانچہ کرشن چندر کے افسانوں کا شاید ایک کردار بھی اس مقام کو نہیں پہنچا
جہاں اس کے ناول "شکست" کا کردار شیام پہنچا ہے۔ اسی طرح عصمت چغتائی کے افسانوں
کے بے شمار کردار "ٹیڑھی لکیر" کے بھرپور کردار شمن کا مقابلہ نہیں کر سکتے یہاں بھی افسانہ
کی تنقیص ہرگز مقصود نہیں کہنے کا مطلب صرف یہ ہے کہ ناول کا ایک اپنا مزاج ہے جو
اس کی پس منظر کی کشادگی سے تشکیل پذیر ہوا ہے۔ دوسری طرف افسانے کو ایک محدود میدان

میں اپنے جوہر دکھانے پڑتے ہیں چنانچہ افسانہ نگار تاثر میں شدت پیدا کرنے کے لیے کردار کے ایک خاص پہلو کے تجزیاتی مطالعے کو ہی پیش نظر رکھتا ہے اور نتیجتاً ایک مشکل فنی مرحلہ سے گزر کر کامیابی حاصل کرتا ہے۔

ناول اور افسانے کا آخری اہم فرق طریق کار اور تاثر کے ضمن میں ابھرتا ہے ناول میں مختلف واقعات مختلف اور متنوع اثرات پیدا کرتے ہیں اور یہ اثرات کئی ایک شاخوں میں منقسم ہو کر آگے بڑھتے اور ناول کے بنیادی تاثر میں ختم ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ناول کی مثال اس دیو پیکر درخت کی سی ہے جس کی چھوٹی چھوٹی جڑیں مل کر ایک بڑی جڑ کی تشکیل کرتی ہیں اور پھر یہ بڑی جڑیں مل جل کر ایک بڑی جڑ کو وجود میں لاتی ہیں اور جب اس قسم کی چند بڑی جڑیں ایک مقام پر ملتی ہیں تو درخت کا تنا معرض وجود میں آتا ہے ناول میں بھی چھوٹے چھوٹے واقعات مل کر ایک خاص صورت حال یا تاثر کو جنم دیتے ہیں اور اس قسم کے کسی تاثرات مل جل کر اس بنیادی تاثر کو کروٹ دیتے ہیں جو ناول کی جان ہوتا ہے۔ کردار کے ضمن میں بھی ناول کا طریق کار یہی ہے۔ ناول کا کردار باقاعدہ ابھرتا اور تدریجی ارتقا یا نزل کے مراحل سے گزر کر ایک خاص صورت میں ڈھلتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اور مختلف "اتفاقات" حادثات اور خارجی زندگی سے اس کے مختلف روابط، ان پہلوؤں کو نمایاں کرتے ہیں جن کا مجموعی نتیجہ اس کردار کی شخصیت ہے ناول کے برعکس افسانہ ایک بالکل دوسری صورت حال کا مظہر ہے ہر افسانے کا ایک بنیادی نقطہ ہوتا ہے اور افسانے کے عام واقعات اسی ایک نقطہ کو ابھارنے کے لئے وقف نظر آتے ہیں۔ چنانچہ ایک اچھے افسانے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کا ہر واقعہ تاثر بلکہ ہر فقرہ ایک ہی مرکزی نقطے کی تعمیر میں صرف ہو۔ اسی چیز کو

بالعموم مقصد کی اکائی کا نام بھی دیا جاتا ہے جس کا مطلب فقط یہ ہے کہ افسانے میں صرف ایک ہی منزل ہوتی ہے جہاں سارے واقعات اور تاثرات براہ راست متعلق ہوں تو افسانے کا مزاج اس بات کا مقتضی ہے کہ اسے افسانے سے خارج کردیا جائے گویا ناول کی بہ نسبت کہیں زیادہ کفایت کا طالب ہے اور اس کا مجموعی تاثر بڑی حد تک اس کفایت ہی کا رہین منت ہوتا ہے مقصد کی اکائی کے ساتھ ساتھ تاثر کی اکائی بھی افسانے کا طرۂ امتیاز ہے جیساکہ اوپر ذکر ہوا ناول کے اندر مختلف واقعات مختلف تاثرات پیدا کرتے ہیں اور یہ تاثرات مل کر ایک مرکزی تاثر کو جنم دیتے ہیں۔ لیکن افسانے میں تمام چھوٹے چھوٹے واقعات ایک ہی تاثر کو وجود میں لاتے ہیں اور یہی افسانے کا بنیادی تاثر ہوتا ہے یہی حال کردار کا ہے کہ ناول میں مختلف واقعات کردار کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہیں اور پھر یہ تمام پہلو مل جل کر کردار کی بنیادی صورت کو وجود میں لاتے ہیں لیکن افسانے میں مختلف واقعات کا مقصد کردار کے صرف ایک ہی پہلو کو نمایاں کرنا ہوتا ہے اور جب یہ پہلو نمایاں ہوجاتا ہے تو افسانے کا مقصد پورا ہوجاتا ہے۔

سطور بالا میں ناول اور افسانے کے درمیان ایک حدِّ فاصل قائم کی گئی ہے تاکہ اس پس منظر میں ناولٹ کی حدود کا تعین ہوسکے۔ ظاہر ہے کہ ناولٹ کو اپنا وجود تسلیم کرانے کے لیے کچھ ایسے امتیازی اوصاف پیش کرنے ہوں گے جو ناول یا افسانے کے مزاج سے اسے ایک جداگانہ حیثیت عطا کرسکیں اوپر ہم نے دیکھا ہے کہ افسانے کا ایک اپنا مزاج ہوتا ہے اور اس کے مختلف واقعات، زندگی یا کردار کے صرف ایک پہلو کی نقاب کشائی کرتے ہیں۔ دوسری طرف ناول زندگی یا کردار کو اسی کے تمام تر پہلوؤں کے ساتھ پیش کرتا ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ ناولٹ کے حدود کیا ہیں؟ کیا ناولٹ زندگی یا کردار کے صرف ایک پہلو کو پیش کرتا ہے یا تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے یا پھر ان دونوں صورتوں کے بین بین اپنی ہستی کا ثبوت بہم پہنچاتا ہے؟ پہلی صورت میں ناولٹ اور افسانے میں کوئی فرق باقی نہیں رہ جاتا دوسری صورت میں ناولٹ اور ناول میں حدِّ فاصل قائم نہیں ہوسکتی۔ رہی تیسری صورت تو اس کی حیثیت NOMAN'S LAND کی سی ہے اور اس میں ناول اور افسانہ ــــ دونوں کے اثرات اسی طور گڈمڈ ہو جاتے ہیں کہ ایک تیسری مکمل صنفِ ادب کا وجود شک و شبہ کی نذر ہو جاتا ہے۔

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں ناول پر بحث کی گئی ہے۔ لیکن ناولٹ کا بطور ایک علیٰحدہ صنف ادب کے کوئی تذکرہ نہیں۔ آکسفورڈ ڈکشنری میں ناولٹ کو ایک علیٰحدہ صنف ادب قرار دینے کے بجائے محض ایک چھوٹا ناول کہہ کر بات ختم کردی گئی ہے۔ البتہ تھامس ایچ۔ اُذل (THOMAS H. UZZEL) نے افسانہ، ناول اور ناولٹ کی حدود کا تعین کیا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ناول ایک بالکل علیٰحدہ صنف ادب کا درجہ رکھتا ہے۔ پس ضرورت اس بات کی ہے کہ تھامس اذل کے نظریے کا تجزیہ کیا جائے تاکہ ناولٹ کے وجود یا عدم وجود کے بارے میں کوئی نتیجہ اخذ کیا جاسکے۔

تھامس اذل نے ناولٹ کے اجزائے ترکیبی کے بارے میں تو بحث نہیں کی البتہ ناول افسانے اور ناولٹ کے فرق کو مختلف اشکال سے واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً افسانے کے مزاج کو انھوں نے اس طرح

واضح کیا ہے:
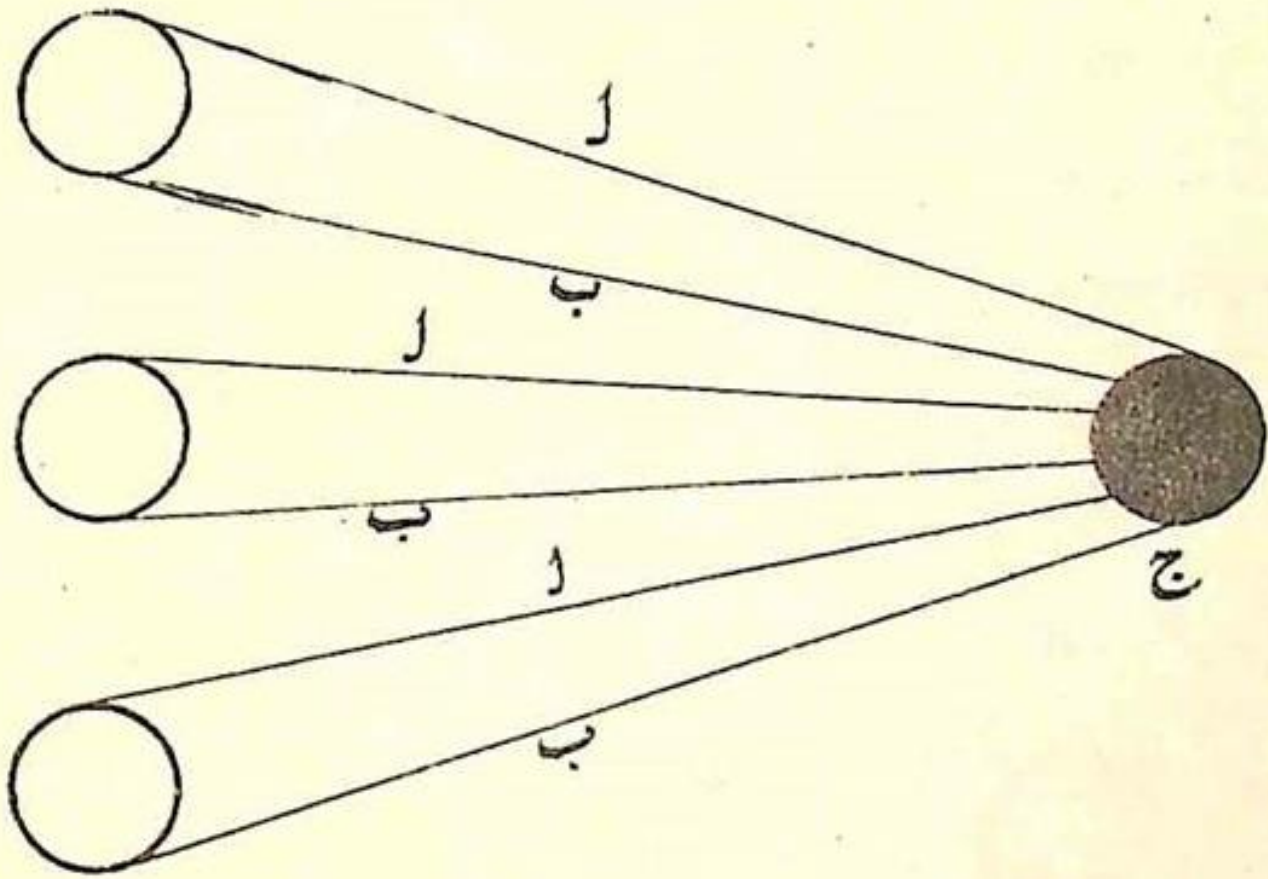
اڈل کے قول کے مطابق اگر اس شکل کے دائروں کو واقعات کی علامت قرار دے لیا جائے تو ان کے اثرات یا نتائج ا اور ب کی صورت میں براہ راست ج کے مقام تک پہنچیں گے اور یہی کہانی کا بنیادی اور مرکزی تاثر ہوگا۔ لیکن ناول میں صورت اس قدر سادہ اور اثرات کی پہنچ اس قدر بلاواسطہ نہیں ہوگی، چنانچہ ناول کے مزاج کو اڈل نے اس شکل سے واضح کیا ہے۔
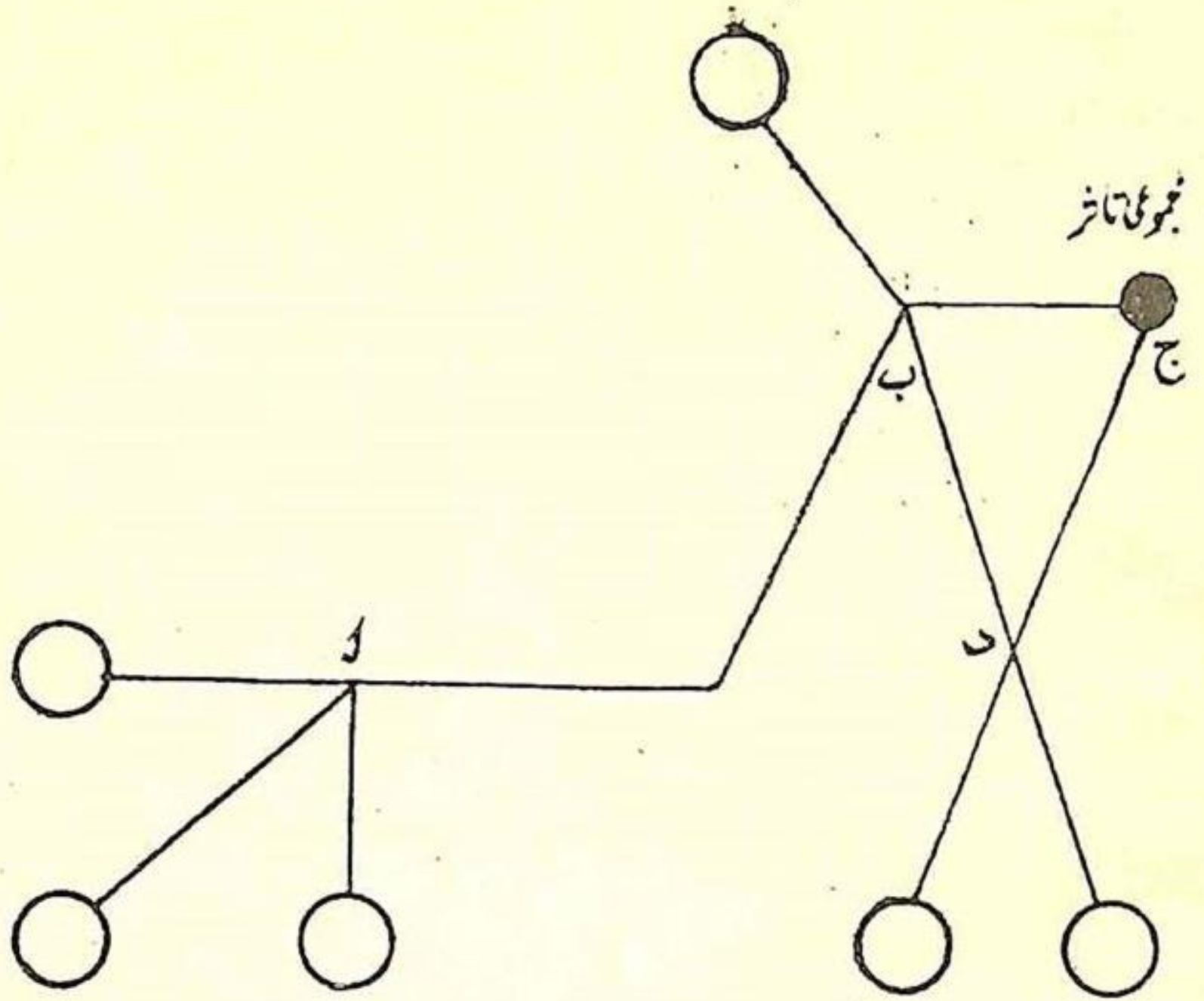
اس شکل میں دائرے واقعات یا کرداروں کی علامت ہیں لیکن ان کے نتائج براہ راست ج کے مقام تک پہنچنے کی بجائے مختلف منازل ا، ب، د پر ملنے کے بعد ج کی طرف پیش قدمی کرتے اور زندگی یا کردار کے ایک بھرپور تاثر کو جنم دیتے ہیں۔

یہاں تک بات تو بالکل صاف اور واضح ہے لیکن جب تھامس اذل ناولٹ کے مزاج کو بھی اسی انداز سے واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو الجھن پیدا ہو جاتی ہے مثلاً ناولٹ کے لیے انھوں نے یہ شکل پیش کی ہے۔
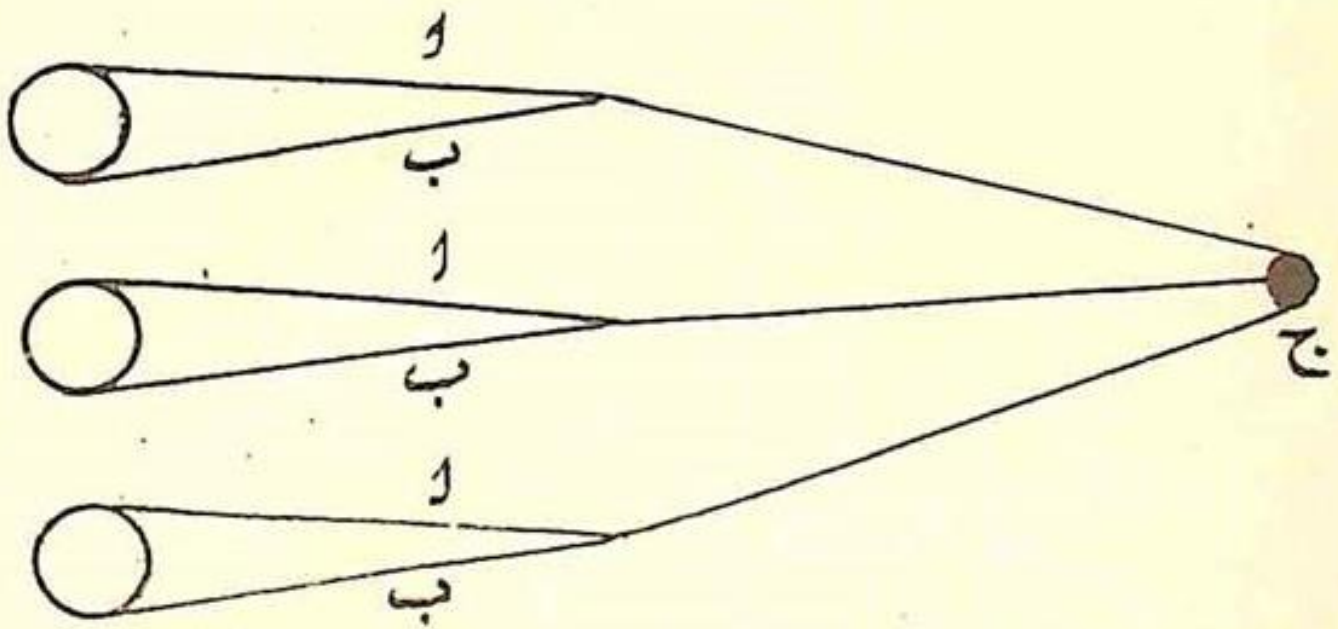
اس شکل کی مدد سے وہ کہنا غالباً یہ چاہتے ہیں کہ ناول نہ تو افسانے کی سی سادگی اور بلاواسطہ طریق کار کا حامل ہے اور نہ اس میں ناول کی سی پیچیدگی اور پھیلاؤ ہی پیدا ہوتا ہے لیکن انداز تشریح سے ایک نئی صنف ادب کا وجود تو ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ ناولٹ کے بارے میں تھامس اڈل کی پیش کردہ شکل بھی زیادہ سے زیادہ اسے ناول کی ایک صورت قرار دے سکتی ہے اور بس! وہ اس طرح کہ کہانی میں اگر اثرات مرکز پر بلاواسطہ طریق سے پہنچیں تو یہ افسانے کا روپ ہوگا اور اگر بالواسطہ طریق سے پہنچیں تو ناول کا۔ چونکہ اڈل کے قول کے مطابق ناولٹ میں اثرات بالواسطہ طریق اختیار کرتے ہیں لہذا ہم زیادہ سے زیادہ اسے ایک مختصر ناول کہہ کر پکار سکتے ہیں۔ بعینہ جس طرح بلاواسطہ طریق کی حامل کسی ایک کہانی کو ہم زیادہ سے زیادہ ایک طویل مختصر افسانے کا نام دے سکتے ہیں۔ پس بطور ایک علیحدہ صنف ادب کے تاحال کٹھالی میں ہے اور اس کی حدود کا تعین کرنے سے پہلے ایک لحظہ کے لئے رُکنے اور سوچنے کی اشد ضرورت ہے۔

روٹھی

جنگل کی بھیگی ہوئی ہوا درختوں گھاس اور کلی کی باس سے بوجھل اور اونچے پتھروں سے ٹکراتا جھاگ اڑاتا بہتا ہوا پانی نیلی دھند میں گھری وادیاں بادلوں کی سیاہی میں چھپی چوٹیاں بل کھاتی سڑک خاموشی کا جادو جھرنوں کی کل کل سے ٹوٹتا ہے۔ گاؤں کے لوگ اپنے کاموں میں مگن سر اٹھا کر دیکھتے ہیں اور میرا پوتا مسکراتا ہے۔ شام سناٹے میں گم ہو رہی ہے۔ نیچے وادیوں میں چراغ ٹمٹماتے ہیں جیسے آسمان ہمارے قدموں میں بچھا ہو۔

"بابا ہم تھوڑی دیر میں اپنی منزل پہ پہنچ جائیں گے۔ آپ کو سردی تو نہیں لگ رہی ہے۔ بڑا لمبا سفر تھا۔ آپ کمزور ہیں نا اس لئے میں ڈرتا ہوں کہیں طبیعت بگڑ نہ جائے۔

میں آپ ہی آپ مسکراتا ہوں اسے کوئی جواب نہیں دیتا۔ ایک تیز

موڑ آتا ہے۔

رات کی سیاہی ہمارے چاروں طرف ہے۔ سڑک کے کنارے جگنوؤں کی برات مکی کے کھیتوں پر سے گزر رہی ہے۔ جانے کتنا سمے بیت گیا ہے دھرتی کی مانگ یونہی سجتی ہے براتیں یونہی گزرتی ہیں۔ دور کسی گھنے کنج میں کوئی پپیہا بولا ہے۔ تھوڑی دیر خاموشی رہی ہے ایک تیز سیٹی سی بجاتا جانور ہمارے پاس سے گزر گیا ہے پھر نیلاہٹ میں تارے آنکھیں جھپکانے لگے ہیں۔ دوج کا چاند ہولے سے دھند کے اوپر ریت میں دبے ہوئے سکے کے کنارے کی طرح چمکا ہے۔ دور سے روشنیاں اور شہر نظر آتا ہے۔ ہم منزل کے قریب آ گئے ہیں۔

منزل کونسی منزل کس کی منزل؟

شیر دل نے بہت ملائمیت سے محبت سے جھک کر کہا ہے "بابا آپ تھک گئے ہوں گے۔ میں ابھی آپ کا بستر لگوائے دیتا ہوں" میرا دل اس بے پناہ محبت اور ملائمیت کے نیچے اپنے فرض سے سبکدوشی کے ایک احساس سے جو شیر دل کی آواز میں ہے نرم ہو رہا ہے۔

محبت کا ایک بول کیسے دل کو پگھلا دیتا ہے۔

میں نے روشنی بجھا دی ہے۔ میری بوڑھی ہڈیوں میں سردی کی وہ لہر جو کھلی کھڑکی سے اندر آ رہی ہے لرزتی ہوئی ہولے ہولے سما رہی ہے۔ مجھے

اپنا وجود ایک لاش کی طرح سردی کے اس کنڈ پر تیرتا لگتا ہے۔ وجود جو مردہ یادوں، بیتی کہانیوں، گزری محبتوں، مایوسیوں اور ناکامیوں، خوشیوں اور مسرتوں کی لاش ہے۔ وجود جسے مریم نے ٹھکرایا تو کسی نے کبھی قبول نہ کیا۔ جسے کبھی کہیں کوئی ٹھکانہ نہ مل سکا۔ حیرت ہے ایسی مکمل اور بے پناہ حسن سے مدہوش اپنی خوشبو سے آپ ہی دیوانی ہوتی رات میں مجھے مریم کی یاد کیوں آئی ہے۔ کیا رات بھی مریم ہے کنواری غصہ ور اور اپنی خوبصورتی سے گناہ کی حد تک آشنا۔

رات مریم ہے اور رات مریم نہیں ہے۔ رات آسرا ہے پناہ گاہ ہے محبت کی خوشبو ہے۔ لمس کی نرمی ہے۔ سانس کی پاکیزگی سے وسعت کی حد تک درماں کرنے والی ہے اور مریم اس نے ایک بے سہارا دل کو سہارا نہ دیا۔

شیر دل نے اندر آکر بتی پر ہاتھ رکھا تو میں نے کہا "نہیں بیٹے بتی مت جلاؤ" میری آواز میں آنسوؤں کی رندھن ہے جسے محسوس کر کے وہ اندھیرے میں ہی میری طرف آیا ہے۔ اس نے میرے تکئے پر ہاتھ رکھا اور جھک کر پوچھا۔

کیوں بابا کیا آپ کو یہ ٹھنڈ اور خوبصورتی پسند نہیں آئی۔ یا تھکن سے پریشان ہیں؟ نہیں بیٹے تم پریشان کیوں ہوتے ہو۔ میں اچھی

طرح سے ہوں۔ صرف یوں لگتا ہے جیسے یہ جگہ میں نے پہلے بھی کہیں دیکھی ہے۔ یہ کمرہ اور اس میں سیلن کی ایک دبی دبی سی بو جسے کچھ کہہ نہ سکو یہ بے نام اداسی جو زندگی کے کنارے سے لپٹی لگتی ہے یہ ساری چیزیں۔

شیر دل ہولے سے ہنس دیا۔ اس نے کہا،" آپ اگر سو سکیں تو اچھا ہو۔ تھکن اتر جائے تو ہر طرف تازگی خوشبو اور خوشی ہو گی۔ اس کے لئے ہمیں صبح تک ٹھہرنا ہو گا۔ تا کہ وقت گزر جائے اور اپنے ساتھ اداسی کا احساس لے جائے۔ کیا میں یہ کھڑکی بند کر دوں؟"

میں کروٹ بدل کر آنکھیں بند کر لیتا ہوں۔ اسے کیا بتاؤں کہ وقت گزر جاتا ہے اور احساس باقی رہتا ہے۔ ہاں صرف احساس ہی باقی رہتا ہے اور زمانوں کے پار سے برچھی کی انی کی طرح چبھتا ہے۔ تم اس احساس کو ایک ایسی کرچ کہہ سکتے ہو جو کبھی نکالے نہیں نکلتی۔ دوج کا چاند دھند کے پردوں میں بھربھری ریت میں دھنسنے والے سکّے کی طرح چھپ گیا ہے۔ مکمل سیاہ رات تاڑ کی کنواری سر پہ تاروں بھری چنری ڈالے تیزی سے لپک جھپک گزر رہی ہے۔ میں نے سیدھا اس کی آنکھوں میں جھانکا وہ بھی بنا پلکیں جھپکائے میری طرف دیکھ رہی تھی اور اس کا چہرہ ہر قسم کے جذبات سے خالی تھا۔ میں نے سوچا تھا وہ خفا ہو گی مگر وہ خفا نہ تھی، خوش نہ تھی اس کے چہرے پر جھنجھلاہٹ نہ تھی۔ ان کالی آنکھوں میں گہرے توبے کی سی ٹھنڈک

اور تاریکی تھی۔ میں اس لڑکی کو پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ میں اسے کیا جانتا تھا کیا جان سکتا تھا؟

گارمی خان نے اُسی رات جب ہم پہنچے تھے اور بے پناہ تھکن سے چور ہو رہے تھے۔ ہمارے گوپے میں آکر کہا تھا" مریم لڑکی نہیں ایک قوت ہے۔ تم شیر سے لڑ سکتے ہو اسے گرا سکتے ہو مگر مریم کسی بھی آدمی کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ تم مریم کو نہ خرید سکتے ہو اور نہ ہی ہار دے سکتے ہو۔"

گارمی خان نے دیسی شراب پی رکھی تھی وہ لڑکھڑا رہا تھا۔ پھر نور خاں آیا اور اسے گھسیٹ کر لے گیا۔ میں اور پیرن ہنسنے لگے اور رات بیت گئی ریت کے ٹیلوں سے اوپر ریگستان کے دل میں جہاں رہنمال پوسٹ تھی اور ہم لوگ کئی دنوں کے سفر کے بعد یہاں پہنچے تھے۔ اپنی ہمت اور قوتِ برداشت کو آزمانے کے لئے دوسروں پر اپنا آپ ثابت کرنے کے لئے میں نے اپنی مرضی سے ایک معمولی سپاہی کی زندگی پسند کی تھی۔

آج یاد آتا ہے تو ہنسی آتی ہے۔ آدمی ساری زندگی کیا کیا حماقتیں کرتا ہے۔ دیوانوں کی طرح خوابوں کے پیچھے بھٹکتا ہے۔ اندھیروں سے اندھیروں

تک سفر کرتا ہے۔ اپنے آپ سے بچنے کے لئے کیا کیا مصیبتیں برداشت کرتا ہے۔ ساری عمر جو اپنے سے ہی بے خبر رہتا ہے اور آج جب کھلی کھڑکی میں سے سیاہ رات اندر آئی ہے۔ بادلوں کی دھند نمی کی طرح کمرے میں بھر گئی ہے۔ ٹین کی چھت پر چھائے آخروٹ کے درخت پر سے قطرے ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔ جیسے کوئی آنکھ مچولی کھیلتے میں بھاگتا ہی جائے۔ ایک ہنسی کا نغمہ کسی اوٹ سے سنائی دیتا ہے اور پھر گھنٹیاں سی بجنے لگی ہیں۔ جیسے کہہ رہی ہوں وقت بیت گیا اور تم کچھ بھی ثابت نہ کر سکے۔ وقت بیت گیا اور وقت بیت گیا اور وقت بیت گیا۔

تم نے رینگنے والے ایک کیڑے کی طرح جی لیا۔

جھاڑیوں سے پرے جگنوؤں کی طرح آنکھیں جگمگا اٹھی ہیں پر میرے لئے نہیں ان کی جوت میرے لئے نہیں ہے۔

کرنل مرزا نے کہا تھا "میاں ایک سپاہی کی زندگی میں کوئی کشش نہیں اور پھر سرحد کی فوج تو اور بھی سختیاں سہتی ہیں۔ کبھی دشمن گھات سے نکل کر حملہ کر دیتے ہیں ہر وقت چوکس رہنا پڑتا ہے۔ زمین کے ایک ایک انچ کے لئے اپنی زندگی کی قیمت چکانی پڑتی ہے۔ میری مانیں تو یہ خیال دل سے نکال دیں۔" مگر مجھے اپنے بابا کی گرجتی ہوئی آواز سنائی دے رہی تھی۔ جس نے کہا تھا۔

"تم سب کیڑوں کی طرح میرے جسم کا خون چوس کر زندہ ہو، تم میں خود اتنی سی ہمت بھی نہیں ہے کہ اپنے آپ کو سنبھال سکو۔ میں نے آج تک ایک نہایت شفیق باپ کی طرح تمہاری ایک ایک ضرورت کا خیال رکھا ہے اور جب کہ میں ایک فیصلہ کر چکا ہوں تم سب کیا کہنا چاہتے ہو۔ کیوں بھیڑوں کی ایک ریوڑ کی طرح میرے پاس جمع ہوئے ہو؟ میں علاقے کا مالک و مختار ہوں مجھے اس کا اختیار حاصل ہے میں جو چاہوں گا کروں گا اور تم مجھے اپنے زور اور جوانی سے نہیں ڈرا سکتے۔ جاؤ زمانے میں نکلو اس کے گرم و سرد کا مقابلہ کرو۔ اپنی ہمت کا امتحان لو۔ اپنی جگہ خود بناؤ۔ میں نے اور میرے آباؤ اجداد نے اس علاقے کے لوگوں کا خون چوسا ہے اور آج تک زندہ رہے ہیں۔ میں نہیں چاہتا تم اور تمہارے بعد میری تمہاری نسلیں یہی کچھ کریں۔ زمانے کا تقاضا ہے کہ تم اپنے آپ کو ثابت کرو۔ سن رہے ہو جاؤ اپنے آپ کو ثابت کرو۔"

میں اور میرے سترہ بھائی ان کا منہ دیکھتے رہے اور پھر بابا کے پاس بھی محلوں اور نوبت خانوں کے سوا کچھ باقی نہ رہا۔ محل کے دروازے پر سپاہیوں کا پہرہ اب بھی تھا۔ ان گنت سامان سے بھرے محل ہر جگہ تھے۔ موٹر خانوں میں موٹریں نئی دلہنوں کی طرح آراستہ کھڑی تھیں۔ عدالتوں میں ان کے نام کے آگے اب بھی ظل الٰہی لکھا جاتا تھا۔ مسجدوں میں اب بھی خطبوں میں ان کا نام آتا

تھا۔ مگر بابا کو خود معلوم تھا کہ وہ بجھتا ہوا دیا ہیں۔

ہمارے اور ان کے درمیان سدا پردے اور فاصلے رہے۔

کرنل نے اپنے طور پر مجھے سمجھایا۔ شدید گرمی اور ہڈیوں کا گودا تک جما دینے والی سردی کا ذکر کیا۔ تہذیب کے ہر مرکز سے دوری کا خوف دلایا مگر مجھے تو ایک عام آدمی کی طرح اپنے آپ کو ثابت کرنا اور بابا کی گرج کا جواب گرج سے دینا تھا۔ میں خود اپنا مالک و مختار تھا ایک ایسا انسان جس کے سارے بندھن شکستہ زنجیر کی طرح ٹوٹ چکے ہوں۔ پندرہ سو میل پھیلے اس علاقے میں سناٹا تھا اور میں اس سناٹے سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔

میں نے ایک معمولی سپاہی کی طرح کرنل کے سامنے والی کرسی سے اٹھ کر سلام کیا اور الٹے قدموں باہر نکل آیا۔

بانکی چتون اور خوبصورت آنکھوں والی مادہ اونٹ اٹکھیلیاں کرتی ہوئی یوں آگے بڑھ رہی تھی جیسے بجرہ پانی پر تیر رہا ہو۔ میں پہلی بار اونٹنی پر سوار ہوا تھا۔ سجی سجائی ہوئی۔ دلھن کی طرح زیوروں سے آراستہ۔ کسا ہوا جسم، چمکتا بدن اور سورج کی روشنی میں مہاروں پر لگے شیشے آنکھیں مار رہے تھے۔ سر پر بندھے مورے کے پھندن کوڑیوں اور موتیوں کی

جھالروں سے بوجھل، رنگین دھاگوں سے بنی گانی تک آتے اور اسے چھوتے ہوئے۔ ناک میں چاندی کا لاٹا۔ گوربند میں ذرا ذرا سے گھنگرو لٹکتے ہوئے کہ چلنے میں ان میں سے آواز نکلتی جو گھٹنوں پر بندھے بتوٹے اور ٹخنوں کی جھانجھروں میں ساز میں سُر پیدا کرتی۔ پلان جس پر میں بیٹھا تھا سیاہ دھاگوں سے بنا تھا اور اس میں بھی کوڑیاں بڑے بڑے منکے موتی پھندنے تھے۔ آگے جس اونٹ پر سامان لدا تھا اس کے ساتھ سیاہ بٹے ہوئے اون سے بُنے رسّوں سے میری اونٹنی کا رشتہ قائم کیا گیا تھا۔ گھنٹیاں اس رسّے میں جگہ جگہ پروئی ہوئی تھیں کہ چلنے میں بہت سہانی آواز آتی ہے اگلے اونٹ کی مہار تھامے ایک راہبر تھا اور پچھلے اونٹ پر بیرن تھا جس نے میرے منع کرنے کے باوجود دو اونٹوں کو سامان سے لاد لیا تھا۔

سورج اس علاقے میں مانو سوا تیزے پر کھڑا رہتا ہے۔ آسمان سے آگ برستی ہے۔ گرم دوزخی ہوا کے جھکڑ چلنے میں ریت کے پہاڑ اُڑ کر اِدھر سے اُدھر ہوتے ہیں۔ دن جینے کو ناقابلِ برداشت بنا دیتا ہے۔ ہر طرف خاک اڑتی ہے۔ اجنبی آدمی راہ بھول جاتا ہے۔

شام ڈھلے سورج میں ذرا ادھیرج آتا ہے تو ریت ٹھنڈی پڑنے لگتی ہے۔ مسافر جنڈ اور کیکر کی سائے سے اٹھتے ہیں۔ جوتے اور کپڑے

جھاڑتے ہیں اور تاروں کی چھاؤں میں اپنی منزلوں کی طرف جاتے ہیں۔
پہلے پہر اونٹوں کے گلے میں پڑی گھنٹیوں کی ٹنٹناہٹیں گیتوں کے بولوں میں
ڈھلتی ہیں اور ریت کے ان پہاڑوں میں جہاں کوئی پگڈنڈی نہیں لوگ
ستاروں کی سمت دیکھ کر راہ طے کرتے ہیں۔ تیز آندھیاں سیلاب کی طرح
جب تندی سے چلتی ہیں تو پہاڑوں کو ایک پل میں اٹھا کر ذرّوں کی طرح
بکھیر دیتی ہیں۔

شام کا تارا مغرب میں چمکا تو ہم لوگوں کا قافلہ بڑی نہر کی پٹڑی سے اتر
کر اس راہ پر ہو لیا جو تیس ہزار میل کے رقبے میں پھیلے اس صحرا کے کنارے
کنارے چھوٹی بڑی بستیوں، اجاڑ شہروں ویرانوں، ڈاہروں گھاس کے
قلعوں۔ کھوک اور لانے کے جنگلوں میں سے ہوتا ہوا صحرا کے دل میں رنہال
پوسٹ تک اترتا ہے۔

کبھی یہ علاقے بھی آباد تھے۔ یہ جگہ دریا کی گذرگاہ تھی۔ یہاں بستیاں
تھیں۔ بھرے پڑے گاؤں تھے اور خوشی تھی۔ نہریں تھیں زندگی تھی۔ پھر ہولے
ہولے یہ سارے علاقے بے توجہی کا شکار ہو گئے۔ نہریں ریت سے اٹ گئیں
آبادی کم ہو گئی گاؤں اُجڑ گئے۔ جانوروں کے گلوں کو لے کر پانی اور چارے
کی تلاش میں روہیلے نہروں کے قریب آباد ہو گئے۔

ہم ایسے ایڑے ترچھے راستوں سے جا رہے تھے جن کا اندازہ مجھے نہیں

ہو سکتا۔ ہیرن اور اس کا ساتھی کبھی کبھار باتیں کرنے لگتے اور پھر لمبے وقفے خاموشی کے آتے جس میں صرف اونٹوں کے گلے میں بندھی گھنٹیوں کی صدا آتی یا جھانجھروں کے گیت۔ صحرا کی ہوا نشہ بن کر میرے رگ و پے میں اتر رہی تھی۔ مجھے نیند سی آنے لگی تھی مگر میں مہاریں پکڑے اونٹنی کو تیز چلانے کی کوشش کر رہا تھا۔

کبھی ان ویرانوں میں آبادی ہوگی۔ ہرن کی آنکھوں والی عورتیں ان لبالب بھری نہروں کے کناروں پر چلتی ہونگی۔ حسن و عشق کے کیا کیا قصے نہ ہونگے زندگی کی ہماہمی اور زمین کی دھڑکتی نبضیں زمانوں سے یہاں پر ختم ہو چکی تھیں مارڑ کی کنواریاں حسین اور جوان مرد گیتوں سے گونجتی فضائیں اور پانی کے ٹوبوں کے کنارے گول ٹوپیوں کی سی چھتوں والے کھپ کی گھاس کے جھونپڑے مویشیوں کے گلے میں بندھی گھنٹیوں کے نغمے تازہ دوہے دودھ کی خوشبو اور صبحدم صحرا کی نرم ہوا جس میں جادو ہوتا ہے۔

ہیرن نے قطب نما نکالا۔ دیا سلائی جلا کر سمت کا تعین کیا۔ "راہبر نے کہا تم مجھ پر بھروسہ کرو ہیرن میں ان راہوں سے آنکھ بند کر کے گزر سکتا ہوں۔"

ہیرن نے کہا، "میں اپنے لئے نہیں سائیں کے لئے دیکھ رہا ہوں۔ مجھے اپنی فکر نہیں ہے میں گم بھی ہو جاؤں تو کیا غم ہے۔"

راہبر نے کہا، "تمہیں قطب نما سے بھی کچھ پتہ نہیں چل سکتا۔ ریت کے ٹیلے

دھوکا دے جائیں گے۔"

میں اپنی اونٹنی کی چمکتی مہار پکڑے ریت اور خشک ہوتی جھاڑیوں کی بُو کو محسوس کرتے ہوئے ہچکولے کھاتا جیسے جھوم رہا ہوں خاموشی سے ان دونوں کی باتیں سُن رہا تھا۔ اور سنسانی رات تیر کی طرح ہمارے سروں کے اوپر آوازوں سے خالی لگتی تھی اور پھر بھی گزرتی جارہی تھی۔ پھر دونوں نے گیت گانا شروع کیا بول بہت دھیرے دھیرے میرے گرد بکھرتے اور سمٹتے تھے۔ ٹھنڈی ہوا اور نرم جھونکوں کے ساتھ مل کر آواز پھیل رہی تھی اونچی اٹھتی جارہی تھی جیسے ستاروں بھرے آسمان کو چھولے گی۔ ہمارے گرد ریت کے ٹیلے اور خشک جھاڑیوں کے جھنڈ بھی اس لَے میں شامل ہو گئے ہیں۔ گیت ہر شے پر چادر کی طرح چھا گیا۔

میں نے اپنے گھر میں صرف اعلیٰ درجہ کی موسیقی سنی تھی۔ مغربی طرز پر گائے ہوئے مشرقی گیت جن میں سوائے دل اور جلن کے کوئی شے نہیں۔ سب طرف محبت کا پرچا سننے کے باوجود محبت کوئی ارفع و اعلیٰ جذبہ نہیں لگتا۔ محبوب اتنا قریب کہ ہاتھ بڑھا کر اُسے چھو سکو۔ زندگی کی ہر خوشی کو مہنگے یا سستے داموں خرید سکو تڑپ اور طلب کی شدت کا کہیں دور دور تک پتہ نہیں سپاٹ اور بے حسی کا شکار زندگی۔

میں نے جب بھی کسی لڑکی کو چاہنے کی کوشش کی پتہ چلا کہ وہ پہلے سے میری نگاہ کی منتظر تھی۔ ہجر اور فراق کے قصوں میں وہی بدمزگی جیسے بہت باریکی ہوئی کسی شے میں۔ محبت نے کبھی اپنے سے باہر دیکھنے پر مجبور نہیں کیا۔ سوز دروں سے

بھی بے گانہ۔ مگر اس گیت میں جو صحرا کی ہوا کے دوش پر اڑ رہا تھا اور جسے دو سادہ قاعدوں اور قانون سے ناآشنا آدمی گا رہے تھے۔ جانے کیا تھا کہ مجھے اپنے اندر ایک خلا ابھرتا لگا۔ جیسے بیماری سے اٹھ کر بہت زوروں کی بھوک لگ آئے اور دل ڈوبنے لگے۔

راہبر نے کہا "سائیں اب ہم بھوک اور لانے کی خشک جھاڑیوں کے جنگل میں سے گزر رہے ہیں۔ اونٹنی کی مہار ذرا مضبوطی سے پکڑیں۔ اندھیرے میں گڑھوں کا پتہ چلانا مشکل ہے اور پھر یہ سنے ٹھیکیدار بے پرواہ کئے بنا کہ بستیوں کے لوگ راہوں پر سے گزرتے ہیں جہاں جی چاہے کھار بنانے کے لئے گڑھے بنا لیتے ہیں۔ پچھلی بار یہ راہ صاف تھی۔ مگر اب اس پر گزرے موسم کی خشک بوٹیاں بکھی ہوئی جھاڑیاں پڑی ہیں۔ جیسے کسی چیل کا بکھرا ہوا گھونسلہ ہو۔ مادہ اونٹ کے پاؤں کے نیچے چرمر کی آواز آتی اور وہ بھی بہت سنبھل کر آگے بڑھتی تھی۔ ہم شام کے چلے تھے اور اب ہمارے سروں پر سے سات ستاروں کی کھاٹ جسے مولوی صاحب نے بچپن میں جانے کیا کہا تھا اور جس کا نام مجھے یاد نہیں پڑتا تھا کھسک کر نیچے اتر آئی تھی۔ ٹھنڈی ہوا میں ایک ملائمیت تھی۔ میری آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ میرے چاروں طرف ایسی بو سی تھی۔ جیسے کوئلے اور جلن کی چراندسی ہو۔ میں نے کہا "بیرتی اب رکنا چاہئے آخر آج ہی تو منزل پر پہنچنا ضروری نہیں ہے۔ میں تھک گیا ہوں۔"

راہبر نے کہا "ذرا سا اور چلیں گے تو ایک بستی آئے گی وہاں آرام کرنے

کی جگہ ہو گی۔"

صبح کا تارا آنکھ جھپکانے لگا تھا جب جھاڑیوں اور جلن سے پرے ایک جھنڈ اندھیرے میں کالے سایوں کی طرح نظر آیا۔ یہ سیاہ دھبّے سے ہماری نگاہوں کے سامنے بڑھتے اور پھیلتے گئے۔ ہم ایک بستی کے سرے پر آ گئے تھے۔

آنکھ کھلی ہے تو گرمی اور پسینے کے مارے بُرا حال تھا۔ میں ایک جھونپڑے کے اندر تھا جس کا دروازہ بمشکل گز بھر کا اونچا ہو گا جیسے ایک منّی سی کھڑکی ہو اندر ریت پر بچھے بستر کی نمی خوشگوار بھی لگتی ہے اور ناگوار بھی۔ گنبد نما چھت میں سے ایک کرن اندھیرے میں اُترتی اجنبی سی بھٹکی ہوئی کنواری کی طرح لگی باہر دھوپ تمتما رہی تھی یوں معلوم ہو رہا تھا روشنی اور تپش کے جھکّڑ سے چل رہے ہوں۔ زمین پر ایک جلانے والا نور پھیلا تھا۔ میری زبان سوکھ رہی تھی۔ گو بیرن پنکھا جھل رہا تھا مگر بے پناہ شدت کی جلن تھی کہ کسی طرح کم نہ ہو سکتی تھی۔ رومال سے پسینہ پونچھ کر میں نے پانی مانگا تو بیرن نے مجھے ستو گھول کر دئے۔

سائیں اس گرمی میں یہ ہزار شربتوں سے بہترین پیاس اور بھوک کے علاوہ گرمی کے اثر کو زائل کرنے میں ان کا کوئی جواب نہیں۔

میں نے ستو پی کر ایک آسودگی محسوس کی تو پوچھا اس گھر کے رہنے والے کہاں گئے۔ تم نے ان سے یہ کیسے حاصل کیا۔

کہنے لگا آپ دھوپ ڈھلے دوبارہ سفر کے لئے باہر نکلیں گے تو آپ کو خود ہی

معلوم ہو جائیگا۔ میں نے پھر کچھ نہیں پوچھا۔ دوبارہ نیند نے مجھ پر یورش کی۔ خواب میں میں نے دیکھا کہ ٹھنڈے پانی کے چشمے رواں ہیں اور لوگ عید کی طرح خوشیاں کرتے نئے نئے کپڑے پہنے پانی کے کنارے بیٹھے ہیں۔ جگہ جگہ قالین بچھے ہیں۔ کالی آنکھوں والی جوان عورتیں ستاروں سے جڑے جوڑے پہنے اپنے گھاگھرے اٹھا کر جس کی گوٹ چمک رہی ہے ناچنے کی تیاریاں کر رہی ہیں۔ ان کے سروں پر چنریاں ہیں جن میں صبح کے تارے ٹکے ہیں گلابوں کی مہک چاروں طرف ہے ایک میٹھا مشروب جو شراب نہیں پیتے ہوئے لوگ جھوم رہے ہیں۔ مرد جن کی نگاہوں میں نرمی ہے اور بازوؤں میں طاقت ناچنے میں عورتوں کا ساتھ دے رہے ہیں۔ ناچ کے چکروں میں گھومتی عورتیں جب ہاتھوں سے چنریوں کے کنارے اٹھاتی ہیں تو ستاروں کی جوت سے آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔ ہوا میں خوشبو اور جنگل کی مہک ہے جیسے بارش ابھی برس کر کھلی ہو اوپر آسمان سیاہ ہے اور بادلوں کی گرج سنائی دیتی ہے۔ درختوں کی جھنڈ سے پرے کائیوں کے بولنے کی آواز آتی ہے۔ لوگ الاؤ جلائے جانے کیا پکا رہے ہیں۔ آگ کی گرمی بڑی دل خوش کن ہے۔ بادلوں کی سیاہی کالی رات سے بھی زیادہ دبیز ہے چاروں طرف چہل پہل اور مستی ہے۔ ایسی خوشی جو میں نے اپنے بابا کے محلوں میں بھی کبھی نہیں دیکھی۔ سجی سجائی اونٹنیاں کھڑی ہیں۔ جب وہ گردن اِدھر اُدھر ہلاتی ہیں تو ایسی ایسی دلفریب آواز ان گھنٹیوں میں سے آتی ہے جو ان کے سر اور گردن

کے زیوروں میں ہیں۔ پھر ناچ ختم ہو گیا اور میں کبھی نہانے کے لئے ایک آبشار میں کود جاتا ہوں۔

جاگ کر میں نے دیکھا کہ جھونپڑے میں اندھیرا تھا۔ پیرن اور ہمارا راہبر باتیں کر رہے تھے۔ میں پسینے میں بھیگا ہوا تھا۔

باہر اونٹ تیار تھے۔ سامان بندھا رکھا تھا اور ہم تینوں کے علاوہ وہاں کوئی نہ تھا۔

میں نے کہا "پیرن اس بستی کے لوگ کہاں گئے کہ کوئی آواز نہیں آتی۔ یہ بستی اجڑی ہوئی بھی نہیں لگتی۔ جھونپڑوں کے دروازے بند ہیں کیا بات ہے؟"

راہبر نے آگے بڑھ کر کہا "سائیں لوگ پانی کی کمی اور گرمی کی شدت سے گھبرا کر بستی کو خالی کر گئے ہیں۔ جب برساتیں آئیں گی رو ہی آباد ہو گی تو یہ خشک جھاڑیاں سبز ہوں گی۔ یہ ٹوبہ جس میں اب سوائے کیچڑ کے اور کچھ نہیں پانی سے بھر جائے گا تو لوگ نہروں کے کناروں سے اپنے گھروں کو لوٹ آئیں گے۔ اب کے بے پناہ گرمی ہے پچھلے سال میں یہاں سے رکن پور گیا تھا لوگوں نے بستی خالی نہ کی تھی۔ آج میں نے کوشش کی ہے گلیوں میں گھوما ہوں۔ گوپوں کے پٹ کھول کر اندر جھانکا ہے مگر ایک جان بھی یہاں نہیں۔"

میں ٹوبے کے کنارے کھڑا تھا اور سانس روکے پریوں کی کہانیوں کے اس گاؤں کو دیکھ رہا تھا۔ گاؤں جس کو کسی طلسم کے زور سے خالی کیا گیا تھا۔ اندھیرے

گویے قبروں کی طرح خالی تھے۔ زندگی یہاں پر صرف پانی کا سوال بن کر رہ گئی تھی۔

میں نے اپنے یہاں پانی کی افراط پر شکر کیا اور بہت دنوں بعد ویران بستی کی چھوٹی سی مسجد کے دراڑیں پڑے صحن میں سجدۂ شوق ادا کیا۔ اس لذت اور سرور کو میں آج بھی محسوس کر رہا ہوں۔

چاند لانے اور کھار کی جھاڑیوں پر چمک رہا تھا۔ ڈاہروں اور ریت کے سرابوں سے آباد یہ ویرانہ جہاں ہرنوں کے غول کلیلیں کرتے بھاگتے پھرتے ہیں گروہوں میں جمع ہو کر چارے کی تلاش کرتے ہیں۔ بھیڑیوں کے خوف سے چھپتے اور پھر بھی زندہ رہنے پر خوش۔ زندگی ہر جگہ رواں دواں ہے۔ جھاڑیاں تیتروں سے آباد تھیں کیونکہ ان کے بولنے کی آواز بار بار آتی تھی۔ اور میرا ہاتھ بے خیالی میں اپنے کندھے کی طرف جاتا تھا جہاں بندوق نہیں تھی۔ ہم جھاڑیوں کے ایک جھنڈ سے نکلے تو لومڑی کود کر دوسری طرف نکل گئی۔ اس کی پھولی ہوئی دُم ہوا میں اٹھی ہوئی تھی۔ پھر گیدڑوں کے رونے کی آواز کہیں قریب سے آنے لگی دور ڈاہر پر بھاگتے ہوئے ہرنوں کی قطاریں نظر آئیں۔

راہبر نے کہا "یہ پہلی چاند راتیں ہیں جلد ہی چاند چھپ جائے گا تو اندھیرے میں ہم کسی جگہ ٹھہر کر آگ جلائیں گے پھر تماشا دیکھئے گا۔"

میں اور پیرن آنے والی گھڑی کا انتظار کرنے لگے۔

چاند جھاڑیوں کے جنگل پہ چمک کر بے نور ہوتا اور جھکتا چلا گیا۔

آگ جلا کر ہم لوگ ذرا اوٹ میں ہو گئے۔ میرے ہاتھ میں بھری ہوئی بندوق تھی۔ ہم سب دم سادھے ہونے والے تماشے کا انتظار کرنے لگے۔ دیر تک کچھ بھی تو نہ ہوا۔ میں اس بے فائدہ انتظار سے تھک ہی چلا تھا جب میں نے جھاڑیوں میں تیتروں کے بولنے کی آواز سنی اور پھر انھیں قطار باندھے آگ کی طرف آتے دیکھا۔ میں نے گنا تو وہ گیارہ تھے اور بہت اطمینان سے آگ سے تھوڑی دور پرے رکے ہوئے تھے۔ میرا اٹھا ہوا ہاتھ رک گیا۔

"پیرن انھیں بھی ہماری طرح جینے کا حق حاصل ہے۔ میں ان کے اطمینان کو دھوکا کیوں دوں"۔ میں اوٹ سے باہر نکل آیا۔

جھاڑیوں کے جھنڈ چھدرے ہونے لگے اور گھاس کا میدان جھاڑیوں کے حاشئے سے شروع ہوا جلی ہوئی گھاس کے نشانوں پہ چلتے ہوئے ہم نے دور دور تک انسان یا جانور کا نشان ڈھونڈنے کی کوشش کی مگر یہاں پر زندگی کی سن گن بھی نہ تھی۔ ایسا سناٹا جس میں اکیلے آدمی کا دل دہل جائے روح میں ایک عجیب ویرانی پھیلنے لگی۔ پھر جانے کب مجھے نیند آگئی اور میں سو گیا۔ اونٹنی کی مہاریں میرے ہاتھ میں ڈھیلی ہو گئیں گردن ایک طرف جھک گئی۔ زندگی میں پہلی بار ایک مختصر جگہ میں جہاں آدمی کا آرام کرنا ممکن نہ ہو انسان

کی ضرورتیں کتنی کم ہیں اور قدرتی تقاضے کتنے اٹل۔

ڈرگن پور میں بھی ہم نے آدمی کو تلاش کرنے کی کوشش کی مگر پکے مکانوں کی سنیدی اور آسائش پانی کی کمی سے مات کھا چکی تھی۔

راہبر نے کہا "کسی زمانے میں یہ گھی اور دودھ کی منڈی تھی۔ ہندو تاجر صحرا کے دل میں چونے کی چٹان پر رہتے تھے اور راجپوتانے تک تجارت کا سامان بھیجتے تھے۔ اب سوائے مندر کے وہاں پر کوئی شے آباد نہیں۔"

مندر آباد تھا میں نے آسن پر مورتی کو دیکھا جو ایک ٹمٹماتے دیئے کی روشنی میں دودھ میں نہائی ہوئی لگتی تھی۔ پجاری نے رات کی پوجا کے لئے تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ وہ اکیلا گھنٹیاں بجا رہا تھا۔ سوگند سے بھرے مندر کی چوکھٹ کے باہر سے جب میں لوٹا ہوں تو سندل کا ٹیکا لگائے اور کھڑاویں پہنے وہ باہر کی چار دیواری تک میرے ساتھ آیا۔ تلسی کے پودے دروازے کے باہر سبز اور خوشنما لگتے تھے۔ اس نے کہا بھگوان کا کرنا تھا کہ میں اکیلا مورتی کی رکشا کے لئے یہاں رہوں۔

تلسی کے پودوں کی طرف اشارہ کر کے میں نے کہا "آدمیوں کے پینے کا پانی تو یہاں ملتا نہیں تم انھیں کس طرح تازہ رکھتے ہو۔"

اس نے چونے کے بنے ہوئے چوڑے ڈھکنے کو زمین سے اٹھا کر ایک طرف کر دیا۔ ایک چھوٹا سا کنواں پانی سے بھرا تھا۔ نتھرا ہوا صاف پانی۔

کہنے لگا۔"بھگوان کی دیا ہے۔جب پانی پڑتا ہے تو مندر کے پچھواڑے ٹوپے میں سے لاکر میں پوری گرمی کی ضرورت کے لئے یہ مادے چونے کے کنڈ بھر لیتا ہوں۔ میں نے دیکھا قطار در قطار درجنوں کنڈ تھے۔چٹان کو کاٹ کر بنائے ہوئے یہ گڑھے زمین میں یوں دبا دئے جاتے تھے کہ پانی خشک نہیں ہوتا تھا۔

میں نے کہا اکیلے میں جی نہیں گھبراتا۔

نہیں قافلے یہاں سے گزرتے رہتے ہیں۔ گرمی کے دو تین ماہ تکلیف ہوتی ہے اور تکلیف بھی کیا۔میرے لئے بھگوان کافی ہیں۔ انھیں کے کاموں سے مجھے وقت نہیں ملتا کہ اکیلا اور اداس ہوسکوں۔ٹھیک ہے جہاں ایک بھگوان اور ایک انسان ہو وہاں معاملہ الٹ ہو جاتا ہے۔وہاں آدمی کو بھگوان کے کام کرنے پڑتے ہیں اور وہ آپ آسن پر بیٹھتا، دودھ سے نہاتا، دیوں کی روشنی میں ایسے سپنے دیکھتا ہے جو اس کے پجاریوں کی سمجھ میں نہیں آتے۔سپنے جن میں وہ اکیلا ہے اور بستیاں اجڑ رہی ہیں اور مندر صرف ایک دئے سے آباد ہیں اور انسان انسان سے نفرت کرتا ہے۔

افسر نے میرے کاغذات دیکھ کر کہا،"یہاں پوسٹ پر آپ کے رہنے کے لئے کیا بندوبست ہوسکتا ہے۔آپ رنہال بستی میں رہیں تو بہتر ہوگا۔ہماری زندگی میں کوئی گھما گھمی نہیں۔عجیب اکتا دینے والی یکسانیت ہے جب کبھی دشمن کے سپاہی اونچے ٹیلوں کے پیچھے سے اپنی بیکاری سے تنگ آجاتے ہیں تو ہم پر حملہ کرتے ہیں ورنہ ہم سرحد کی موہوم لکیر کی نگرانی کرتے یہاں پڑے ہیں۔عام حالات میں یہاں

دم گھونٹنے والا سناٹا رہتا ہے صرف ہمیں چوکس رہنا پڑتا ہے اور تیار۔

تو یہ رنہال پوسٹ تھی۔ جس کے لئے چل کر میں اتنی دور سے آیا تھا۔ مجھے بہت مایوسی ہوئی مگر پھر بھی میں ایک عام سپاہی تھا۔ ریت کے ٹیلوں کے اس جنگل کے دل میں رنہال بستی کے سردار نور خاں کے گھر میں ہمیں ٹھکانہ مل گیا۔

بستی اصل میں پوسٹ سے ایک میل پورب کی طرف تیس چالیس گوپوں کا ایک چھوٹا سا جھنڈ تھی درمیان میں ایک ٹوبہ تھا۔ جب گرمی کی شدت میں ٹوبہ خشک ہو جاتا تو ایک کنوئیں سے کام چلایا جاتا۔ پانی کنوئیں کی تہہ میں تارے کی طرح چمکتا تھا۔ اور بمشکل اتنا ہوتا کہ بستی کے لوگ پیاس بجھا سکیں۔

نور خاں کا گھر بستی کے سرے پر ایک علیحدہ احاطے میں تھا۔ جس میں پانچ چھ گوپے تھے۔ دو گوپے جو احاطے میں ہی تھے جن کا راستہ الگ تھا اور جو اب تک چوپال کے طور پر استعمال ہوتے آئے تھے ہمیں دے گئے۔ بیرن نے اپنا سامان نکالا اور انھیں سجانے میں لگ گیا۔ بڑا گوپا اندر سے کھلا تھا اس کا دروازہ بھی ذرا بڑا تھا۔ اسے ہم نے نشست کے لئے ٹھیک کیا۔ لکڑی کے تختے جوڑ کر ایک تخت بنایا گیا جسے قالین بچھا کر اور تکئے لگا کر ہم نے بیٹھنے کی جگہ بنالی۔ پھوس کی دیواروں کو ریشمی چادروں سے ڈھانپ دیا۔ چھت کے نیچے رنگین کپڑا تان کر گول ٹوپ کے نیچے ایک اور چھت بنائی جس پر چمکتے دھاگے سے تارے بنے تھے اور بتی کی روشنی میں خوب چمکتے تھے۔ زمین پر پھوس بچھا کر اس پر قالینوں کا فرش

کیا اور اپنے حالوں ہم نے محل کا ماحول پیدا کر لیا۔ دوسرے گوپے میں پکانے کے برتن، اناج کا ذخیرہ، شراب کی بوتلیں اور ایسا سامان تھا جس کی ضرورت کا اندازہ پیرن کو ہی ہو سکتا تھا۔

اور یہی پہلی رات تھی جب گارمی خان نے آکر کہا تھا "مریم کو نہ تم جیت سکتے تھے اور نہ وہ تم سے ہار مان سکتی ہے"۔

گارمی خان بستی کا دیوانہ تھا۔ وہ صبح ایک پرانی بندوق کو کندھے سے لٹکا کر باہر نکل جاتا اور تپتی دھوپ میں بھی ریت کے ٹیلوں میں گھومتا پھرتا۔ جب ملک تقسیم نہیں ہوا تھا تو وہ فوج میں تھا۔ پھر یہ لکیر رہال کے سینے پر ابھری تو اس نے بستی میں ایک گوپا بنا لیا اور پوسٹ کی طرف جانے سے بھی انکار کر دیا اس کی شدّتِ انکار کو لوگوں نے اس کی دیوانگی جانا۔ جانے کونسی تلخی تھی جس نے اسے فوج کی زندگی سے اس حد تک متنفر کر دیا تھا۔ دھوپ میں بھی وہ گھومتا رہتا۔ خانہ ساز شراب پی کر رات کو بے سُدھ پڑا رہتا۔ بال بچوں کے جھنجھٹ سے دور اپنی تنہا اداسی کو وہ شکار اور شراب سے آباد کرتا اور پرانے گیت گاتا جن میں عورتوں کے حُسن کا ذکر ہوتا محرومی کی اداسی کا رونا ہوتا مگر جب وہ ہوش میں آتا اور اپنے حواسوں میں ہوتا اور اس سے گیت کا مطلب پوچھا جاتا تو وہ صاف مکر جاتا۔ کوئی گیت اسے یاد نہ تھے۔ لوگ اس سے محبت کا برتاؤ کرتے عورتیں اسے دیکھ کر افسوس کرتیں اور بستی والے اس آدمی کو جس کا اپنا کوئی نہ تھا

اپنے درمیان میں پاکر اجنبی نہ سمجھتے۔

گرمی ہوش اڑا ئے دیتی تھی۔ گائیں بھینسیں مرجھائی ہوئی صورتیں لئے بھانوں کے آگے کھڑی ہوتیں تو نور خاں کی بیوی اور بیٹی شام کو دودھ دوہنے میں لگ جاتیں۔ چاٹی کی گھم کار سے میری آنکھ کھلی تو صبح کے آسمان پر رات کے تاروں کا غبار ابھی باقی تھا اور پورب کی ہوا ریت کو ریشمی ٹھنڈے بچھونے کی طرح بنانے کی خاطر ہولے ہولے تھپک رہی تھی۔ اپنی زندگی میں پہلی بار میں نے جینے کی سادگی ضرورتوں کی کمی اور آسانی کو قریب سے دیکھا تھا۔ ہمارے ہاں ہر شے تہذیب اور رواج کی مناسبت سے دوری یا نزدیکی درجوں اور قاعدوں کی مرہونِ منّت ہے۔

پیرن اور گاری خان کے درمیان ایک خاموش معاہدہ ہو گیا تھا۔ جب سورج ٹیلوں کے پیچھے چھپنے لگتا اور مغرب کی طرف ہوا بادلوں کی لالی بن جاتی تو گاری خاں ہمارے گوپے میں آجاتا۔ سارے دن کی داستان، گزرے بیتے قصے کہتے سنتے۔ پیرن میرا کھانا تیار کرتا۔ میں کھانے سے فارغ ہو کر اکیلا ہی ٹیلوں کی طرف نکل جاتا اور وہ دونوں جانے کب تک بیٹھے رہتے۔

یوسرٹ کے مینار میں بیٹھے جو کسی سپاہی کا خیال آتا اور اپنی بے کار زندگی کا۔ آتے ہوئے میں جلدی میں اور جذبات کی رو میں اپنا ستارہ چھوڑ آیا تھا اگر وہ لے آتا تو شام ابھی گزر جایا کرتی۔ لوگوں کو معلوم تھا کہ میں کون ہوں اسلئے

وہ مجھ سے زیادہ بات کرنے سے گھبراتے تھے۔ بستی کے کنارے گلی کے موڑ پر جھاڑیوں کے قریب ٹیلوں پر گھومتے اگر کوئی مجھے مل جاتا تو وہ میرے گھٹنوں کو چھو کر اور راہ چھوڑ کر الگ ہو جاتا۔ میں ایک اچھوت کی طرح تھا۔ جو مندر کی چوکھٹ سے باہر کھڑا رہ کر بھگوان کے درشن کر سکتا تھا مگر اس کے چرن نہیں چھو سکتا۔

پوسٹ کی طرف جاتا تو سپاہی مجھ سے بات نہ کرتے ان کی آنکھوں میں بے یقینی ہوتی اور حقارت بھی کہ جو امیرزادہ تھا بھلا کیسے ایک عام سپاہی کی زندگی گزارنے آیا تھا۔ نور خاں نے بھی مجھ سے میل جول بڑھانے کی ضرورت محسوس نہ کی تھی۔ روز صبح اٹھ کر اس کے آدمی مجھ سے پوچھ جاتے تھے کہ مجھے کسی شے کی ضرورت تو نہیں۔ اور پھر سارا دن یوں گزر جاتا کہ بستی میں کسی سے بات کرنے کو میرا دل ترس گیا۔

گوپے میں تخت پر بیٹھے دیوانِ غالب پڑھتا میں دیکھتا کہ نور خاں کی بیٹی اور بیوی کاموں میں جتی ہیں۔ احاطے میں باتیں کر رہی ہیں۔ نور خاں اونٹوں پر محنت کرتا۔ محبّت سے ہاتھ پھیرتا انھیں لمبے سفر کے لئے تیار کر رہا ہے۔ یہ سارا تماشا میری نگاہوں کے سامنے ہوتا۔ گلی میں سے عورتیں گزرتیں۔ پیرن سے ہنس کر بات کرتیں۔ مگر گوپے کی طرف بھی دیکھ لیتیں۔ ساری بستی مجھے ایک اجنبی بوجھ کی طرح محسوس کر رہی تھی۔ میں انھیں کیسے سمجھا سکتا تھا کہ میں ان مصیبتوں میں پڑ کر اپنے آپ کو مضبوط بنا رہا تھا تاکہ اپنا آپ اپنے اس بابا پر ثابت کر سکوں جو جانے کب کے

یورپ روانہ ہو چکے ہوں گے اور جن کا بیشتر وقت اپنے کمرے میں بیٹھ کر شطرنج کی بازی جیتنے اور شہ مات دینے میں صرف ہوتا تھا جو علاقے پر ہوتے تو گھبرائے ہوئے رہتے اور یورپ میں رہ کر ریس کھیلتے اور گھوڑوں، مغربی عورتوں اور تھیٹروں پارٹیوں اور کلبوں میں مصروف رہتے اور زندگی سے زیادہ سے زیادہ خوشی حاصل کرنے کے درپے تھے۔ ایک ایسے آدمی کی طرح جو مصر ہو بضد ہو کہ وہ ایک گلاس شراب کو دو گلاسوں میں بھرے گا اور ان سے لطف اندوز بھی ہوگا۔ انھیں دنوں گھومتے پھرتے اور چارے کی تلاش میں سرگرداں روہیلوں کا ایک قبیلہ بستی کے باہر آکر رکا ان لوگوں نے یہاں ایک کنویں کا چرچا سنا تھا اور پانی لینے ٹھہر گئے تھے۔ اس دن سردار کے گھر ہلچل سی تھی اور چھپر یال خالی نہ ہونے کی وجہ سے سارے بڑے بوڑھے نور خاں کے گھر اس چبوترے پر بیٹھے تھے جس پر دودھ کے برتن مکھن کی ٹکیاں اور اناج کے مٹکے رکھے تھے۔ نور خاں کی بیوی جو سخت مزاج اور تیز طبیعت کی تھی بار بار کوپے میں اندر اور باہر آ جا رہی تھی جیسے اسے کہیں بھی قرار نہ آتا ہو۔ پریشان سی ہو کر کبھی برتنوں کو الٹنے پلٹنے لگتی مریم نے سارے جانوروں کو ہنکا کر ٹیلوں کا رخ کیا تو ماں نے کہا۔

"مریم تم آج اکیلی مت جاؤ پرائے لوگ بستی کے باہر ڈیرے ڈالے ہیں۔ لڑکی نے ہنس کر ماں کی طرف دیکھا اور کہنے لگی۔ "تو پھر تم جاؤ گی۔ دیکھتی نہیں

ہو دن بڑھنے لگا ہے اور یہ جو تم دوسرے قبیلوں والوں کا ڈر دیتی ہو کیا تم کو معلوم نہیں کہ میں کسی کو کچھ نہیں سمجھتی۔"

ماں نے زور سے کہا، "تم اپنے باپ کی لاڈلی ہو کسی کی بات کیا مانو گی میں کہتی ہوں کیا تم کسی اور کے ساتھ گائیں نہیں بھیج دو گی۔"

مریم نے ماں کی بات سنی ان سنی کر دی اور گلی میں آگے بڑھ کر سنبل کو آواز دی جو بھیڑوں کو ہنکائے جا رہی تھی۔ پھر دونوں سہیلیاں ٹوبے کے کنارے سے گھوم کر نظروں سے اوجھل ہو گئیں اور گلی سنسان ہو گئی۔

میں گاری خاں کی بات پر غور کرنے لگا۔ پہلی بار مجھے رنہال بستی میں چہل پہل رونق اور جینے کے آثار نظر آئے۔ کوے تیز تیز پر مارتے جاتے تھے اور چڑھتے سورج کی کرنیں دھار والے آرے کی طرح زمین کا سینہ چیر رہی تھیں۔ بچوں کے رونے کی آوازیں۔ بھیڑوں کا ممیانا۔ گائیوں کے گوبر اور موت کی بوٹیلوں پر ریت کے لہریئے۔ خشک جھاڑیوں کے سبز پتے گویوں کی قطاروں میں ایک بے پناہ خوبصورتی ٹوبے کے کنارے کنارے جھاڑیوں کے جھنڈ جو جانے کس طرح ابھی تک سبز تھے۔ کھپ اور پھوگ کے سوکھے ہوئے پودے۔ یہ ویرانہ تو بہت آباد تھا۔

بستی کے لوگوں کا فیصلہ کیا ہو گا کہ بیرن بھاگا آیا اور کہنے لگا، "سائیں آج رات آنے والے قبیلے کو دعوت دی جائے گی تاکہ وہ اپنے آپ کو یہاں مہمان

سمجھیں اور تین دن بعد بنا کسی خون خرابے کے رخصت ہو جائیں۔ سردار نور خان نے یہ طریقہ سوچا ہے۔

شام ٹیلوں کی قطاروں پر اپنے نیلے دھندلکے سمیت اتری اور بستی میں آنے والے جشن کی تیاری دیکھ کر حیرت سے کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ نور خان کے احاطے سے پرلی طرف لوگ قبیلے کے لئے کھانا پکا رہے تھے۔ ساری بستی آج سردار کے ہاں کھانا کھانے والی تھی اس لئے عورتوں نے کنگھی چوٹی کی تھی۔ بچے نئے کپڑے پہنے گلیوں میں گھومتے پھر رہے تھے اور کنواریاں دھلے ہوئے جوڑے پہنے احاطے میں ٹولیاں بنا کر باتیں کر رہی تھیں۔

یہ جشن بستی کے باہر بھٹ پر ہونے والا تھا۔ نقاروں والے نقارے پیٹ رہے تھے۔ ڈھول بج رہے تھے اور پورا چاند ٹیلوں کے پیچھے سے بے قرار ہو کر ابھی سے اس سارے تماشے کو جھانکنے لگا تھا۔ پرندے گھروں کو لوٹ رہے تھے۔ چڑیوں کی ٹولیاں لانی کی جھاڑیوں میں شور مچا رہی تھیں اور نرم ہوا ابھی سے چاندنی کو اڑانے کی کوشش کرتی ہوئی چل رہی تھی۔ اس رات کے مکمل حسن اور سادگی کو میں بھول نہیں سکتا۔ زندگی میں میں نے بہت حسین راتیں دیکھی ہیں۔ ایسی بھی جب انسان کا جی مرجانے کو چاہنے لگتا ہے۔ ایسی راتیں جب جنت کا گمان دنیا پر گزرتا ہے۔ ٹھنڈک، راحت، آسودگی ایسی چیزیں جو محبت کے بنا بھی سکون دیتی ہیں۔ مگر وہ رات سادہ سی تھی۔ پوسٹ کے وہ سپاہی جو

اپنی ڈیوٹی سے فارغ تھے عام کپڑوں میں آئے تھے۔ ہمارا افسر بھی اس میلے کو جو بہت دنوں کی یکسانیت کے جمود کو توڑنے کا کام دینے والا تھا دیکھنے آیا تھا اور اس نے مجھ سے بھی چلنے کو کہا۔ سردار نے خود آکر بھی مجھ سے کہا تھا۔ "سائیں اگر بلاؤں اور آفتوں کو بھلا کر دور کیا جا سکتا ہے تو میں یہی کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ آپ کو دعوت تو کیا پسند آئے گی مگر میرا دل بہت خوش ہوگا اگر آپ ہمارے جھومر اور کھیل دیکھنے آئیں۔"

میں نے سوچا تھا کہ کسی دور کے ٹیلے پر بیرن کے ساتھ دیکھ لوں گا ایک اجنبی کی حیثیت سے شریک ہونے سے تو بہتر ہے کہ محض تماشا دیکھوں مگر جب افسر بھی آیا تو میرا دل خوش ہو گیا۔ ایک سے دو ہوں تو جگہ کی اجنبیت دور ہو جایا کرتی ہے۔ میں نے بہت دنوں کے بعد ذرا اچھے کپڑے پہنے، شراب پی اور روح کو گرم کرنے کا سامان کیا۔ شراب پرانی اور تیز تھی۔ ڈھول مسلسل بج رہا تھا۔ نقارے کو بجانے والا نقارے کو پوری قوت سے پیٹ رہا تھا۔ ریت کے ٹیلوں کی ایک خشک سی بو ملی تھی جس میں مہمان قبیلے کی عورتوں کی لمبی تانوں والے گیتوں کا سہاگ رنگ بھی تھا۔ ہم لوگ بھٹ سے ذرا دور ایک ٹیلے پر بیٹھے تھے اور پھر عورتیں مرد ناچنے والے ٹولوں میں شریک تھے۔ کنواریاں گیت گاتی تھیں ادھیڑ عمر کی عورتیں اور مرد ناچ رہے تھے۔ جب چاندنی تیز ہو گئی ستارے چھپ گئے تو ناچ کی رفتار تیز ہو گئی۔ کنواری لڑکیاں اپنا الگ ٹولہ بنا کر ناچ رہی تھیں۔ ہم

لوگ اس میں شامل ہو گئے تو ساری لڑکیاں شرم کے مارے سکڑ کر کھڑی ہو گئیں۔
مریم نے کولھوں پر ہاتھ رکھ کر بڑی ادا سے کہا "سائیں میں نہ آپ کے لحاظ کے مارے ناچ رہی ہوں اور نہ پوسٹ سے آئے بڑے آدمی کے لئے۔ میرا تو بس ناچنے کو جی چاہتا ہے" اور یہ کہہ کر نقارے کی تیز تال پر گھوم گئی۔ اور سنّبل بھی اس کے ساتھ شریک ہو گئی۔ شراب میری رگوں میں پانی بن گئی۔ یہ کیسی کنواری تھی۔ شاید گاری خاں نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ اب گاری خاں مجھے وہ دیوانہ نہیں لگتا تھا۔
لمبی تانوں والے گیتوں میں شیام سندر کا نام بار بار سننے میں آتا تھا۔ جیسے رکن پور کے مندر کا پجاری تلک لگائے دودھ میں نہائی مورتی کے سامنے بیٹھا کہہ رہا ہو۔۔

"نت جاگن میریاں انکھیاں"

افسر کا ہاتھ پکڑ کر جب میں بھٹ سے اپنے احاطے کی طرف مڑا ہوں تو ہنستی ہوئی لڑکیوں کا ایک ٹولا ہمارے آگے آگے چل رہا تھا۔ وہ مریم کو چھیڑ رہی تھیں اور علیسیٰ خان کا نام لے رہی تھیں۔ چاندنی مجھے پھیکی اور بے کیف لگنے لگی۔ اس لڑکی سے بدلہ لینے کے سارے منصوبے مجھے خاک بنتے جان پڑے۔ میں جو شام کو زندگی کی ہماہمی سے بھرپور اور خوش بستی میں ایک روہیلے کی طرح نکلا تھا گلیوں میں ایک آوارہ امیرزادے کی طرح بھٹکتا ہوا گھر آیا۔ چیزوں، عورتوں اور

محبتوں کو بس میں کر لینے والے انسان کو پہلی بار پتہ چلا تھا کہ اپنا ماضی بھلانا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔

گارسی خاں سچا آدمی تھا۔

تین دن کے بعد قافلہ کوچ کر گیا۔ کھٹ پٹ بجتے ہوئے نقارے، ہونکتی ہوئی گرمی سے بھری فضا میں خاموش ہو گئے۔ اور بستی ایک آفت سے بچ گئی۔ جیسے لمبی بیماری کے بعد اٹھی ہو۔ جوان ہلکے گھوم رہے تھے ان کے سروں سے بوجھ اتر گیا تھا۔ مریم کو میں دیکھتا احاطے میں بھیڑوں کو ہنکا کر لاتی اور روزمرہ کے کام کرتی اسے شاید بھول چکا تھا کہ وہ دعوت والی رات مجھے ایک خاموش مقابلے کے لئے پکار چکی ہے۔ اس کی ماں کی آواز اس کے وجود پر چھا نہیں سکتی تھی۔

سُنبل گلی میں سے گزرتے ہوئے ایک شام بیرن سے کوئی چیز مانگنے کھڑی ہوئی تو میں ہمت کر کے کوپے میں سے نکلا۔ وہ مڑ کر بات ختم کئے بنا جانے لگی تو میں نے اس سے کہا، "ناچ کی رات کی بعد سے کہیں دکھائی ہی نہیں دی ہو؟"

بیرن نے مڑ کر میری طرف حیرت سے دیکھا۔

سُنبل نے بھی اس سے دوگنی حیرت سے مجھے دیکھا اور پھر جھک کر میرے گھٹنوں کو ہاتھ لگا کر کھڑی ہو گئی۔

میں نے کہا آج کل کام بہت ہے کیا؟

سُنبل نے بڑے سکون اور دھیرج سے آنکھیں اٹھا کر میری طرف دیکھا اور

کہنے لگی۔" بلند خاں کا بیٹا عیسیٰ خاں رکھنی پوسٹ سے چھٹی پر گھر آنے والا ہے۔ میں مریم کے ساتھ مل کر اس کے جوڑے میں موتی لگواتی ہوں جو وہ اپنے نکاح پر پہننے والی ہے۔"

تو یہ سکون سے اٹھنے والی آنکھیں میرا راز جانتی ہیں؟

اس شام پہلی بار ٹیلوں کی طرف گھومنے جاتے ہوئے جب میں نے گاری خاں کو دیکھا تو اسے اشارے سے بلا کر اپنے ساتھ لے گیا۔ ہم شام کی سرخی میں غروب ہوتے سورج کی لالی سے رنگین ٹیلوں اور چڑیوں کی آوازوں سے آباد جھاڑیوں سے بھی دور نکل آئے تو میں نے کہا "گاری خاں میں تھک گیا ہوں کوئی گیت سناؤ۔"

اس نے کندھے سے لٹکی اپنی بندوق اتار کر ہاتھ میں پکڑ لی اور اسے پیار سے تھپکتے ہوئے اونچی لے میں ایک عشقیہ گیت گانے لگا۔ پھر وہ ایک ہی فقرے کو بار بار دہرانے لگا۔ یہاں تک کہ شام کے دھندلکے میں، اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے۔ میں نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا تو وہ رونے لگا۔ اس نے بندوق کو سینے سے لگایا چوما، پیار کیا اور کہنے لگا "زندگی میں میری پہلی اور آخری محبوب یہی ہے۔ کیوں سائیں کیا آپ کو میری محبوبہ پسند نہیں۔"

وہ تو سچ مچ دیوانہ تھا۔

ہم جب گھر لوٹے ہیں تو پچھلی راتوں کا چاند ان ٹیلوں کی ریت کو چمکا رہا تھا

جن پر ہم بیٹھے پرانے قصّے زمانے کے ظلم اور جانے کیا کیا دہراتے رہے تھے۔ ہرنوں کی ڈاریں بھاگ رہی تھیں اور ویرانے کی آبادی اپنی ساری خوشبوؤں کے ساتھ حدِ نظر تک پھیلے صحرا کے کناروں پر کروٹیں بدل رہی تھیں۔ اس رات میں اور گاری خاں دیر تک شراب پیتے رہے اور یوں گم صم بیٹھے رہے جیسے کسی کو دفن کر کے آئے ہوں۔

اگلے دن سردار نور خاں کی بیوی نے مجھے گوپے سے نکلتے دیکھا تو کہنے لگی۔
"سائیں آپ مالک ہیں چھوٹا منہ بڑی بات میں کہنا نہیں چاہتی مگر پھر بھی کہہ رہی ہوں یہ بڈھا بہت لالچی، غلیظ اور پاگل انسان ہے۔ اس کو زیادہ منہ لگانا ٹھیک نہیں۔

میں نے سر ہلا دیا اور گوپے میں چلا آیا مجھے شراب پی کر بہکنے والے لوگ پسند ہیں۔ وہ زیادہ سادہ دل اور بے ضرر ہوتے ہیں ان کے جی میں ریا اور فریب نہیں ہوتا۔ میں خود اتنی نہیں پیتا کہ بہک جاؤں۔ ایک ایک جرعہ جیسے کوئی خوشی کی ساعتوں کا استعمال سنبھل سنبھل کر کرے۔ مجھے رگوں میں سیال آگ اچھی نہیں لگتی یوں کہ آدمی اتنا گرم ہو جائے کہ لگے وہ آتش فشاں کے دہانے کی طرح کھلے گا اور بھک سے اڑ جائے گا۔ میں تو خون میں بس اتنی حدّت چاہتا ہوں جو بھولی بسری باتوں کو زیادہ عزیز اور جینے کو قابلِ برداشت بنا دے۔ شام کو گاری خاں مجھے راہ میں ملا اور خاموشی سے میرے ساتھ ہو لیا۔ ہم نے ایک دوسرے سے کوئی بات نہیں کی۔

واپسی میں کہنے لگا" مجھے بیرن نے بتا دیا تھا کہ آپ کو سردار کی بیوی ملی تھی۔ سائیں یہ تویلا کی عورت ہے۔ سردار اس کا چوتھا خاوند ہے۔ پچھلے خاوندوں کو اس نے کیسے ٹھکانے لگایا مجھ جیسے ہوشیار آدمی کو بھی پتہ نہیں چل سکا۔ مریم پر کتنی سختی کرتی ہے اور امرآیا خاں مریم کا بھائی بھی اسی کی وجہ سے رکھنی پوسٹ میں رہتا ہے۔ سردار کو بستی کے لوگوں سے زیادہ ملنے نہیں دیتی۔"

"اچھا" میں نے گوپے کے کنارے جھاڑیوں کے جھنڈ کی اوٹ میں کھڑے ہوئے کہا۔

پانچ سال پہلے کہیں سے ایک قافلہ گھومتا پھرتا آیا اور گوپے کے کنارے جم کر بیٹھ گیا۔ وہ لوگ تعداد میں زیادہ تھے۔ انھوں نے ہماری بستی پر قبضہ کرنا چاہا۔ لڑائی ہوئی اور ان کا سردار مارا گیا۔ یہ اس سردار کی بیوی تھی۔

"اس کے بچے۔"

"بچوں کو قبیلے والے اپنے ساتھ لے گئے۔ وہ اپنے خون کو غیر جگہ کیوں کر چھوڑتے۔ یہ عورت یہاں رہ گئی۔ مریم کی ماں ان دنوں بیمار رہا کرتی تھی پھر ایک دن اچانک سُنا وہ مر گئی۔ سردار نور خاں نے کئی سال اس سے بات نہیں کی اسے مرنے والی سے بہت لگاؤ تھا۔ مگر وقت بڑے سے بڑے گھاؤ کو بھر دیتا ہے اور پار سال اس نے اس سے نکاح کر لیا۔"

"گاری خاں تھوڑی دیر چپ رہا پھر کہنے لگا" لوگ تو کہتے ہیں اس نے

نور خاں کی بیوی کو مار دیا ہوگا۔ مگر میں اس بات کو نہیں مانتا۔ اس عورت کا گھر میں آکر بس جانا ہی اس کی موت بن گیا۔ وہ بڑی دھان پان نازک اور دھیرج سے بات کرنے والی دلہن تھی۔ اس نے اپنی آواز کو کبھی اتنا بلند نہیں کیا کہ گوپے سے پانی لینے جاتی تو عورتیں مڑ کر دیکھیں۔ آپ نے نہیں دیکھا مریم یوں تو ہر لحاظ سے شیرنی ہے مگر نزاکت میں اس کا جوڑ اپنی ماں سے ہے۔"

میں واپس آیا اور بے پرواہ کئے بنا کہ نور خاں کی بیوی نے کیا کہا تھا۔ میں نے اسے شراب پلائی وہ دونوں گھٹنے تہہ کر کے بیٹھا تھا اور گھونٹ گھونٹ شراب کو گلاسوں کے حساب سے پی رہا تھا۔ میں ساقی بنا اسے پلا رہا تھا۔ اور باہر رات چاندنی کی چادر اوڑھے منہ چھپائے کسی سے ملنے جاتی مارڑ کی کنواری لگ رہی تھی۔ دور دور تک ٹیلوں پر جانور تھے اور دھیرے دھیرے دبے دبے پاؤں اٹھاتی کنواری کے جھانجھ بج اٹھے۔ گلی میں کسی اونٹنی کے تیز چلنے کی آواز آئی۔ پھر کسی نے زور سے نور خاں کو پکارا۔ گاری خاں نے کہا "یہ امرایا خاں ہے۔"

امرایا خاں کے ساتھ اس کا دوست بھی تھا۔ دونوں نکلتے قدوں کے جوان ہوتے ہوئے لڑکے تھے اور فوج کی وردیاں پہنے اکڑ کر چل رہے تھے۔ بستی کی لڑکیاں ہماری گلی میں سے زیادہ گزرنے لگی تھیں۔ سویرے سے کنوئیں کو پانی بھرنے جاتے۔ وہ ہمارے احاطے کے سامنے سے رستے اور بالٹیاں لئے نکلتی تو رک کر مریم کو آواز دیتیں اور امرایا خاں کا حال پوچھتیں۔ آنے جانے

والوں کی بھیڑ سی لگی تھی (دوپہر میں آرام کرنے کے لئے لیٹا ہوں تو گوپے کے دروازے کے سامنے سے خوشبودار گھاس کا تختہ ہٹا کر نورخاں اندر آیا اور کہنے لگا" سائیں امرایا آپ کے سلام کو حاضر ہونا چاہتا ہے۔"

دونوں باپ بیٹے قالینوں کے فرش پر بیٹھ گئے۔ بیٹا بے چین آنکھوں سے چاروں طرف دیکھتا ہے۔ اس کے انداز میں ایک بے پرواہی تھی جو پیرن کے بڑی محنت سے سجائے ہوئے اس رنگ محل سے بھی مرعوب نہ ہوئی۔

میں نے پوچھا" کہو امرایا خاں اچھے تو ہو۔ اپنی پوسٹ کا حال سناؤ۔ میرا دل رکھنی دیکھنے کو چاہتا ہے۔ مگر گرمی سے جی چھوٹ جاتا ہے۔"

اس نے بڑی بے یقینی سے میری طرف دیکھا۔ پھر ریشمی چادروں سے ڈھکی پھونس کی دیواروں کی طرف، اور ہنس کر بولا۔

"آپ بادشاہ آدمی ہیں اس گرمی میں سفر کیونکر کر سکتے ہیں۔"

میں نے کہا" نورخاں سے پوچھ لو اس گرمی اور بادشاہی میں آیا ہوں۔ معمولی سپاہی ہوں۔ صرف ہماری پوسٹ کے افسر مجھے تمہارے باپ کے ہمسائے میں رکھ کر خوش ہیں۔"

اس نے اٹھ کر مجھ سے ہاتھ ملایا اور چہرے پر کا غبار صاف کر کے میرے برابر بیٹھ گیا۔ ہم دونوں بہت پرانے دوستوں کی طرح شکار، فوج اور سرحد کی باتیں کرتے رہے۔ رکھنی پر کچھ دن پہلے دشمن کے سپاہیوں نے رات

حملہ کیا تھا۔ معمولی جھڑپ نہ تھی، وہ مشین گنوں سے مسلح ہو کر آئے تھے۔ اتفاق کی بات ہے اس دن ٹاور پر امرآیا کی ڈیوٹی تھی۔ اور جب چاند چھپ گیا تھا تو ٹیلوں کی اوٹ میں سے ہو کر آئے۔ دشمنوں کو دیکھ کر اس نے دور سے للکارا تھا۔ تھوڑی دیر تک خاموشی رہی جیسے پتّہ بھی ہلے تو زمین کے ذرّے بول اٹھیں گے۔ سب نے کہا تمہارا وہم ہوگا۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے اگر انھیں آنا ہوتا تو آ چکے ہوتے۔ گشت پر سپاہی باتیں کرتے اور روزمرّہ کی طرح گیت گاتے پھر رہے تھے۔ وہ اپنی سرحد کے ساتھ آدھ میل تک چلتا گیا اور اچانک انھیں جا لیا۔ مگر یہ اکیلا تھا اور وہ تقریباً دس تھے۔ اس نے اپنی اسٹین گن سنبھالی اور پوزیشن لی۔ گولیوں کی آواز سن کر پوسٹ سے سپاہی بھی اس کی مدد کو پہنچ گئے۔ اس اکیلے نے تقریباً آدھ گھنٹے دشمن کو روکے رکھا تھا۔ جب بڑے افسر گشت پر آئے تو اس کی خوب پیٹھ ٹھونکی گئی اور یہ چھٹی اُسے خوشی کے سلسلے میں ملی تھی۔ ویسے اس کی سرحد پار کے کئی جوانوں کے ساتھ دوستی تھی وہ دوسرے ملک میں جا چکا تھا۔ نمک اور مکھن کے بدلے انھوں نے اسے ایک سفید اونٹ کا بچّہ دیا تھا۔ اس کے دوست کا نام رام دیا تھا۔ وہ صحرا میں دور تک جہاں پانی کی ایک بوند نہیں مل سکتی پہنچ جاتا تھا اور بہت بہادر تھا۔ اس کا باپ کسی زمانے میں رُکن پور میں رہتا اور ڈاکے ڈالتا تھا۔ اُسے سرحد کی اس پار کی زمین سے بہت محبّت تھی۔

میں نے کہا "تمہارے افسر کو اس میل جول پر اعتراض نہیں"

کہنے لگا "یوں سبھی لوگ سرحد پر مل جل کر رہتے ہیں۔ آخر اس سے پہلے تو سبھی ایک جگہ رہتے تھے۔ سپاہی کی زندگی بھی عجیب ہوتی ہے ابھی دوستوں کی طرح ان سے باتیں کرتے ہو ابھی حکم ہوا تو بنا سوچے ان کی جان لے لو اور اس پر لڑتے پھرو۔ میں سوال نہیں کر سکتا کچھ پوچھ نہیں سکتا مگر یہ جاننا چاہتا ہوں کیا اس نظر نہ آنے والی لکیر کے لیے گھتی اور رنہاں اور ایسی پوسٹوں پہ بے کار سپاہیوں کو بٹھانا کیا ضروری ہے؟ پچھلی دفعہ جب حملہ ہوا تو ہمارا ایک سپاہی مارا گیا تھا۔ اس سے اگلے دن وہ چھٹی پر جا رہا تھا اس نے اپنی بیوی کے لیے ریشمی جوڑا کسی نہ کسی طرح منگوایا تھا اور بچی کے لیے کھلونے آپ بنائے تھے۔ کتنے ارمانوں سے اس نے گھر کے سپنے دیکھے ہوں گے اور اس رات حملے میں وہ مارا گیا۔"

میں نے کہا "تمہارے دل میں اس نوکری کے خلاف اتنی شکایت ہے اور پھر بھی تم پوسٹ پر رہتے ہو اسی بہادری کے سلسلے میں چھٹی پہ آئے ہو تمہارے دل میں یہ کیسی بے یقینی ہے۔"

امر آیا بیٹھے سے کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا "میں نے یہاں سے بہت دور شہر کے مکتب میں جا کر قرآن کریم پڑھا تھا۔ جو مولوی ہمیں سبق پڑھاتے تھے وہ ہمارے ساتھ ہر قسم کی باتیں کیا کرتے تھے روح کی اور موت کی اور جینے کی۔ اصل میں وہ مولوی نہیں تھے عالم تھے۔ میں نے ان سے فلسفہ اور حدیث سب پڑھا ہے۔ آپ پوچھیں گے میں بھی کسی مکتب میں مُلّا کیوں نہ بن گیا مگر میں زندگی اور خشک فلسفے عمل اور علم میں فاصلے

مٹانا چاہتا تھا۔ انگریزی تعلیم میرے پاس نہیں تھی جو عہدے دلا سکتی اور میں رکھنی پوسٹ پر سپاہی بن گیا۔

میں نے کہا "سپاہی کا سب سے پہلا سبق یہ ہے کہ وہ سوال نہیں کرتا وہ صرف عمل ہے اور تحمل ہے۔"

وہ کہنے لگا "یہی آگ میرے اندر جلتی رہتی ہے کہ میں کچھ بھی نہ بن سکا۔ مکمل سپاہی تک نہ بن سکا۔ جب ہوا سیٹیوں اور گولیوں کے شور بندوقوں کی ٹھائیں ٹھائیں اور میرے والوں کی چیخوں زخمیوں کی آہوں سے بھر جاتی ہے تو میں سوچنے لگتا ہوں"۔۔۔ باہر سے سیٹی کی آواز آئی تو امراؤ نے کہا "اچھا سائیں اب میں چلتا ہوں صبح سے ملا نہیں اور عیسیٰ خاں مجھ سے خفا ہو جائے گا۔"

وہ کود کر باہر نکل گیا۔ اس کی چال میں ہرن کی سی پھرتی اور آسانی تھی۔ میرے سامنے دیوانِ غالب کے ورق کھلے دروازے سے اندر آنے والی ہوا کے زور سے پھڑپھڑا لئے اور کتاب پہلے صفحہ پر کھلی رہ گئی۔ "کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا۔"

مریم کا نکاح اب کے بھی نہیں ہو سکا۔ نکاح کے مقرر دن سے کئی راتیں پہلے بستی کی عورتیں نور خاں کے آنگن میں اکٹھا ہوتیں اور سہاگ کے گیت گاتیں۔ مریم ان میں گھلی ملی گاتی چلتی پھرتی رہتی جیسے یہ تقریب کسی اور کے لئے ہو رہی ہو۔ نور خاں رکھنی پوسٹ ہوا تھا۔ وہ بھی نکاح کے ساتھ ہی نکاح والے دن آنے والا

تھا۔ چاولوں اور گڑ کی بوریاں اندر جمع تھیں۔ میں دل میں کہتا یہ بھی قسمت کی بات ہے کہ میں مریم سے اس رات کی بے عزتی کا بدلہ نہ لے سکا اور میرے منہ میں کھانا ریت بن جاتا۔ جینا زہر لگنے لگتا۔ میں اپنے بابا پر تو کیا تہذیب کے ہر مرکز سے دور بنی اس بستی کی گنوار لڑکی پر بھی اپنا آپ ثابت نہ کر سکا تھا۔ ان دنوں میں نے شدت سے شراب پینی شروع کر دی۔

آندھی سمندر کے طوفان کی طرح ایک بے پناہ قوت ہے!

کئی دنوں سے ہوائیں ذرا تیز ہی آ چلی تھی۔ گرم دوزخی ہواؤں میں تو کمی تھی مگر رات کے پچھلے پہر جھکڑ چلنا شروع ہو جاتا۔ ٹھنڈی ریت اڑ اڑ کر منہ اور آنکھوں میں پڑتی۔ اور نیند میں نشہ سا گھول دیتی۔ سورج کے نکلنے تک ہوا لوریاں دیتی رہتی۔ سورج نکلنے سے پہلے ہی میں گوپے کے اندر تخت پر لیٹ جاتا اور چاروں طرف بنے گول نشانوں کی طرح روزنوں میں سے ہوا گیت گاتی ہوئی آتی جاتی۔

اس صبح کو گاری خاں ہرن کی پچھلی رانیں لکڑی کے ٹکڑے سے لٹکائے ہرن کے ساتھ اندر چلا گیا۔ پھر گھڑی بھر بعد ہرن نے آکر کہا "سائیں گاری خاں کہتا ہے سائیں نور خاں آنے والا ہے۔ ریت ہر گوشہ کو ڈھانپ لے گی۔ آپ اس سے پہلے ہی کچھ نوش فرمالیں۔ ورنہ پھر ایک ذرہ بھی چبانا دشوار ہو جائے گا۔"

روزن میں سامنے وہ چبوترہ دکھائی دے رہا تھا جس پر مریم دودھ بلو رہی تھی۔ تھوڑی دیر میں میں نے اُمرایا خاں اور عیسیٰ خاں کو گلی کی طرف آتے دیکھا

امر آیا اپنی ماں کے پاس گو پے کے اندر چلا گیا۔ عیسیٰ خاں نے اِدھر اُدھر دیکھ کر ہولے سے مریم کو پکارا۔

مریم اسے دیکھ کر ہولے سے اور پھر اپنے کام میں لگ گئی۔

عیسیٰ نے اپنے سینے کی طرف اشارہ کیا مریم نے پھر اسے دیکھا اور یوں غصے سے دیکھا جیسے ابھی اس کے منہ پر تھپڑ مار دے گی اور قدم پٹختی بھیڑوں کی طرف چلی گئی۔

اس لڑکی کی بے پناہ قوت مدافعت اور بے نیازی نے مجھے مسحور کر دیا عیسیٰ سے اس کی شادی ہونے والی تھی اور اس کے باوجود اس نے اپنے ہونے والے شوہر کی ذرا سی گستاخی بھی برداشت نہیں کی۔ میں چاہتا تھا عیسیٰ کی جگہ میں ہوتا تو اس کے دونوں بازو پکڑ کر مروڑ دیتا۔ میں مریم سے شادی کرنے کی تمنا رکھتا تھا۔

انگاروں پر سنکی اور شراب میں بھگوئی ہرن کی ران کھا کر میں نے کہا، "گاری خاں تم نے ایک بار کہا تھا کہ مریم کسی سے ہار نہیں مان سکتی"۔

گاری خاں نے کہا "وہ عیسیٰ خاں کو کچھ نہیں سمجھتی وہ کسی سے نہیں دبتی اور دیکھ لینا بیاہ کے بعد وہ شوہر کو بہت پریشان کرے گی۔ اس کی مرنے والی ماں بہت سادہ دل تھی اور مریم تو شیرنی ہے شیرنی، میں شکاری آدمی ہوں نا، اس کی اداؤں کو سمجھتا ہوں۔ بستی کی اور لڑکیوں کی طرح اس کا مزاج نہیں ہے یہ

ہنسنے بولنے اور ناچنے میں اس کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا۔"

میں نے کہا "کوئی راہ نہیں کہ یہ شیرنی کسی طرح رام ہو جائے؟"

گاری خاں بڑی سادہ دلی سے مسکرایا اور سوچنے لگا۔

پھر میری بات کا جواب دئے بنا وہ اٹھا اور بڑے بڑے قدم دھرتا گلی کی ململیوں سے گوپے کے کنارے کی طرف کود گیا۔

ہوا ڈراونی اور تیز آواز میں گھوں گھوں کرتی ہوئی چلنے لگی پھر ریت کی لہریں دیواروں کی طرح ایک کے پیچھے ایک نہایت تندی سے ٹیلوں کی طرف بڑھیں اور ان سے ٹکرائیں جیسے سمندر کی لہریں بلند ہوتی جھاگ تھوکتی زور دکھاتی اور آگے بڑھتی ہیں اور یہ طوفانی لہریں ٹیلوں کے ساحل کو ننھے کھلونوں کی طرح دم کے دم میں پٹخنے اور بکھیرنے لگیں۔ حفاظتی پشتے تنکوں کی طرح ان بے رحم موجوں کے سامنے سے ہٹنے لگے۔ ریت کے بادلوں نے سورج کو ڈھانپ لیا۔ ہم ابھی سنبھل رہے تھے۔ چیزوں کو ایک دوسرے کے اوپر ڈھیر کر رہے تھے اور قدم جما کر بمشکل چل رہے تھے کہ فضا ٹھائیں ٹھائیں کی آوازوں سے بھر گئی۔

میں نے اپنے آپ کو بندوق پکڑے اور طوفان میں کودتے محسوس کیا آندھی مجھے اٹھا کر پٹخ رہی تھی اور ٹیلوں کے سہارے اندھوں کی طرح رینگ کر میں آگے بڑھ رہا تھا۔ ایک ناچیز ذرّہ طوفان کی مخالف سمت بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"آج تمہارا امتحان ہے امیر زادے اگر جیت گئے تو جیت گئے۔"

آنکھوں ہی میں نہیں میری روح تک میں ریت کی کچکچاہٹ تھی۔

گولیوں کی آواز میرے آس پاس کہیں ادھر سے ہی آ رہی تھی۔ آوازیں ہی آوازیں میرے چاروں طرف تھیں۔ جیسے ان ریت کے ٹیلوں کے نیچے دفن پرانے لوگ اٹھ کر بھاگے جاتے ہوں۔ لوگ میرے دائیں اور بائیں تیزی سے گزر رہے تھے۔ صرف میں بندوق کو مضبوطی سے پکڑے پڑھنے کی کوشش میں تھا۔ اور مجھ سے چلتے زمانے گزر گئے۔

میر بیرن کی آواز مجھے پکارتی ہوئی اور لوگوں کی صدائیں سنائی دیں اور ریت کو ہٹا کر مجھے باہر نکالا گیا۔

آندھی کے پردے میں دشمن ننہال پوسٹ کے دوسری طرف نکل آئے تھے۔ پہلے بستی والوں پر حملہ کر کے انھوں نے بہت سا نقصان کیا تھا۔ علی خان زخمی ہو گیا تھا۔ نور خان کے گھر میں بہت خاموشی تھی شاید وہ اسے رکھنے لے جا رہے تھے۔

گاری خان نے کہا "آپ نے اس طوفان میں ناحق تکلیف کی بھلا محلوں میں رہنے والے امیر زادوں کو کیا معلوم کہ ریت کے اس جھکڑ میں اپنے آپ کو کیسے محفوظ رکھیں۔"

میں اسے بنا جواب دیئے گوپے سے باہر نکل آیا۔ باہر تارے تھے اور بلاہٹ

تھی اور رات کسی حسین لڑکی کی طرح گھنگروں باتوں سے آراستہ بڑے ناز سے قدم اٹھاتی گزرتی جاتی تھی۔

بستی میں بہت سے اور لوگ زخمی ہو گئے تھے دشمن اپنے زخمی بھی پیچھے چھوڑ گئے تھے۔ میں اپنے آپ کو کبھی ثابت نہیں کر سکوں گا۔ میں سپاہی بننے کے نااہل تھا۔ زخمیوں کو دیکھنے میں اور بیرن گئے۔ وہ آنکھیں بند کئے لیٹے تھے۔ اور ہوش میں ہونے کے باوجود کراہتے تک نہ تھے۔ دشمن اور دوست سب برابر پڑے تھے ایک کمسن لڑکا جس کی مسیں ابھی نہیں بھیگی تھیں ہنستا ہوا اٹھنے کی کوشش کرتا تھا میں نے جھک کر کہا" افسوس ہے تم زخمی ہو گئے"۔

" اس میں افسوس کی کیا بات ہے۔ میں سب سے آگے تھا۔ ان تینوں کو بھی میں نے نشانہ بنایا تھا" اس نے بازو سے دشمن کے سپاہیوں کی طرف اشارہ کیا" ایسے میں ایک آدھ خراش لگ جانا کیا ہے۔ ہم نے برستی گولیوں میں کبھی ہار نہیں مانی۔ میں بلند خاں کا بیٹا ہوں۔ عیسیٰ خاں کا چھوٹا بھائی۔ مریم میری بھانجی ہے"۔

میں نے کہا" تم سردار نور خاں کے گھر اپنے بھائی کے ساتھ کیوں نہیں آئے"۔

میری آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا" میں نے عیسیٰ سے کئی کہا تھا کہ جس گھر میں پرایا آدمی ہو وہاں کیوں جاتے ہو۔ وہ کہتا تھا دو چار دن کی بات ہے اور اب سنا ہے لوگ اسے رکھنی لے گئے ہیں۔ وہ بہت زیادہ زخمی ہے"۔

میں نے کچھ کہنے کیلئے منہ کھولا اور پھر بند کر لیا۔

مریم کو میں دیکھتا کہ گیتوں کے سہاگ راگ کے بعد بھی وہ اسی تندی سے کام کر رہی ہے۔ لانے کی سوکھی جھاڑیاں گھسیٹ کر آنگن میں لائی۔ دودھ کے بھرے برتنوں کو بڑے سے تنور پر گرم کرتی۔ اس کی ماں کی چیخ دپکار شور اور گھر میں اپنی جگہ کا بے پناہ احساس بھی شامل ہوتا۔ مگر وہ اس عورت کے وجود سے بے نیاز کام کئے جاتی۔ اس کی سہیلیاں جیسے تسلی دینے کے لئے احاطے میں جمع ہوتیں مگر وہ ان سے اپنی بھیڑوں کی اور آنے والی برسات کے دنوں کا ذکر کرنے لگتی میں نے اپنے کوپے میں بیٹھے اس کے چہرے پر غم کی پرچھائیں ڈھونڈنے کی کوشش کی بے بسی کا کھوج لگانے کی کوشش کی مگر وہاں تو بے پناہ مصروفیت تھی۔ جو باپ کے جانے سے اور بڑھ گئی تھی۔

کوئی دس دنوں کے بعد نور خاں واپس آیا تو بلند خاں بھی اس کے ساتھ تھا۔ گٹھے کپڑوں میں سے مضبوط جسم جھانکتا ہوا۔ تیز اور روشن بڑی بڑی آنکھیں۔ چہرے پر عام لوگوں سے زیادہ سمجھ بوجھ کی علامتیں تھیں۔

میں نے کہا" بلند خاں میں تمہارے بیٹے کو دیکھ کر خوش ہوا ہوں وہ بہت کم عمر اور بہادر ہے۔"

کہنے لگا" مالک میں نے زندگی سے اور کچھ نہیں پایا۔ صرف یہ دو بیٹے ہیں مرنے والی بڑی بہادر عورت تھی، نیک دل نے اپنی بھی دو نشانیاں چھوڑی ہیں۔ دونوں نے اپنے خون میں بہادری کا ورثہ پایا ہے آج جیرا جینا اور ان پر محنت کرنا سہل ہو گیا ہے۔

مریم دودھ کا برتن لئے چبوترے پر کھڑی تھی۔ اس نے آنکھیں اُٹھا کر میری طرف دیکھا۔ اس نگاہ میں احسانمندی نہ تھی نرمی نہ تھی۔ وہ نگاہ تیکھی نہ تھی۔ میٹھی نہ تھی، اس میں روشنی نہ تھی۔ اور نہ تیزی، بلند خاں کے بیٹے کی طرح وہ بھی مجھے کچھ نہ سمجھتی تھی۔

سڑک پر سے کوئی جوان گاتا ہوا گزر رہا ہے۔ گیت کے بول بوندوں کے شور میں گونجتے ہیں۔ جانے کون منچلا ایسی سرد اور تاریک رات میں اپنا دل بہلانے کے لئے گانے کا سہارا لے کر گزرتا جا رہا ہے۔ کھلی کھڑکی میں سے بادل اندر گھس آئے ہیں اور میرے چہرے پر ان کی نمی آنسوؤں کی طرح بوندیں بن رہی ہیں۔ مگر شیر دل کب کا سو چکا ہوگا۔ اور میری بوڑھی ہڈیوں میں اتنا بل نہیں کہ اُٹھنے اور پھر لیٹنے کا متحمل ہو سکے۔ اس لئے میں گیتا گوونداکے بھولے ہوئے ٹکڑے اپنے دل میں دہراتا ہوں اور اس ساون کو یاد کرنے میں لگا ہوں جو خوشیوں اور مسرتوں کا تھا۔

اس رات گھٹن تھی اور ریت کی تپش میں کمی نہیں ہوئی تھی۔ نور خاں اور مریم دوسرے لوگوں کے ساتھ سوکھے ہوئے گوپے کے ڈھلوان راہ کو ٹھیک کر رہے تھے۔ میں ٹیلے پر لیٹ نہیں سکتا تھا کہ زمین میں سے گرمی کا شعلہ نکل کر بدن کو جھلس دیتا تھا۔ مریم کے ماتھے پر اس کی چنری کے ستاروں کا جھرمٹ اندھیرے میں دیئے کی روشنی کی وجہ سے شعلوں کی طرح دہک اٹھتا۔ اس کی سیاہ

آنکھیں بڑی بڑی اور روشن لگ رہی تھیں۔ پیرن بھی کام میں لگا تھا۔ صرف میں ٹہل رہا تھا اور ایک لمحہ کے لئے ٹھہر کر ٹکٹکی باندھ کر بلند خاں کی ہونے والی بہو کو دیکھتا۔ اس نے میری نگاہوں کی گرمی کو اپنے چہرے پر محسوس کر لیا ہوگا۔ کیونکہ عورت میں ایک چھٹی حس ہوتی ہے جو اسے نگاہوں کی چوری سے آگاہ کرتی ہے، کہ اس نے گھوم کر اندھیرے میں دیکھا جہاں میں پیرن کی طرف بیٹھ کئے کھڑا تھا۔ اس کے کرتے پر لگے موتی اور شیشے لپک کر انگارے بن گئے اور اس ایک لمحہ وہ مجھے اتنی حسین لگی، اتنی حسین لگی کہ میں اس کو حاصل کرنے کے لئے ساری دنیا اس کی قیمت، دینے کو تیار تھا مگر مریم کے لئے ایک دنیا کم تھی بہت ہی کم۔

بستی کے لوگ اب رہ رہ کر آسمان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ جہاں بادل کا ایک آوارہ ٹکڑا تک نہ تھا اور چاند کی پیلاہٹ میں ستارے دور دور تک آنکھیں جھپکا رہے تھے۔ رات اور سبے رحمی سے دم سادھے ہوئے تھی۔ بلبلاتے بچوں کے رونے سے جلنے کا اور اس بے پناہ گھٹن کا شدید احساس ہو رہا تھا۔ لوگ چپ تھے۔ پھر اس چاندنی میں ٹیلے پر سے ہرنوں کی ایک ڈار گزری چند لمحے ٹیلے کے سرے پر ان کے مہیب لمبے سائے نیچے کھیت پر پڑے۔ لانے کی جھاڑیوں میں چڑیوں نے بے وقت بولنا شروع کر دیا۔ ہولے ہولے پر مارتا ایک ایک بگلہ سفید چاندنی کا ایک ٹکڑا سا ہمارے سروں پر سے گزر گیا۔ گیدڑوں کے

چیخنے کی آواز فضا میں شور و غل بن گئی ——— دور کسی ٹیلے پر زمین سے ملتا ہوا آسمان سفید بادل کا ایک بہت چھوٹا پھریرا لے کر دوستوں کی طرح ہماری بستی کی طرف آیا اور پھر چاندنی میں گھل گیا۔ پھر ایسے پھریروں کی قطاریں ہی آنے لگیں۔ چاندنی پھریرے لئے ہوئے بادلوں سے پھر گئی اور بکھرے ہوئے ریت کے سے لہرئیے بناتے بادل چنگیرے بھر بھرے ریگستان کے ٹیلے لگنے لگے۔ ہوا دم بدم ٹھنڈی سی ہوتی گئی۔ پھریرے باندھے صحرا کے اوپر سے سیاہ گھٹائیں مہیب لشکروں کی طرح گزرنے لگیں۔ چاندنی بادلوں کی اوٹ میں چھپ گئی۔ دیئے بجھ گئے اور بادل گرجنے لگے۔ اور پھر بوندیں پڑنے لگیں۔

میں نے اپنا چہرہ مریم کی آنکھوں کی سی کالی رات میں اوپر اٹھا دیا۔ اور بوندیں محبت بھرے بوسوں کی طرح میری آنکھوں کے بپوٹوں پر ہونٹوں کے کناروں پر رخساروں پر بالوں پر اور ریت سے اَٹے بالوں پر پڑنے لگیں۔ میں نے چاہا میں سب کا سب سجدۂ شوق بن جاؤں۔ پانی تمام رات پڑتا رہا۔ تاریک آسمان برس پڑنے کو تیار لگتا تھا۔ بجلی رہ رہ کر چمکتی اور اس روشنی میں ٹیلوں پر بھاگتے مرد اور بچے دکھائی دیتے۔ خوشی کی آوازیں مل کر ساون کے بادلوں کا شکریہ ادا کرنے والے لفظوں سے بنے گیت گاتے ہوئے لوگ جیسے کسی عجیب دیوتا کی پوجا کے لئے رات کے سمے جمع ہوئے ہوں۔ بارش دھندلی چادر کی طرح ہمارے چاروں طرف بکھرتی گئی۔ ہوا فراٹے سے چل رہی تھی۔ اور پھر پھڑپھڑاتے ہوئے کپڑے

کی طرح پانی کی تیز دھاریں آ آکر ہم سے لپٹتیں۔ ایسی دھوم کی برسات میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ ایسی رُت جس میں ترسے ہوئے پیاسے ہونٹ آبِ حیات پیتے اور زمین کشکول کی طرح پھیل کر پانی کو اپنے دامن میں بھر لیتی۔

دن کو میں نے دیکھا تھا کہ خشک بوٹی کے ڈھیروں کو عورتیں کندھوں پر اُٹھا کر لاتیں اور گوپوں کے ساتھ ساتھ باندھ کر رکھ رہی تھیں۔ جھیتوں پر بوٹی کو اس طرح رکھا جا رہا تھا۔ گاری خاں نے بیرن کو بھی ہدایت کی تھی "دیکھنا پانی سے بچنے کے لئے اس سے اچھا اور کوئی طریقہ نہیں۔ میں بھی اپنے گھر کو بچانے کے لیے یہی کچھ کرتا ہوں۔ ایک برسات میں بے پرواہ رہا تو اندر کھڑے ہونے کی جگہ نہ تھی۔ بندوق پر بھی پانی ٹپکنے لگا تھا اور میں اپنے ہمسائے نازو خاں کے گھر رات گزارنے پر مجبور ہو گیا۔ نازو خاں خود تو بڑا شریف آدمی ہے مگر اس کی عورت بس چڑیل سمجھو۔ ایسے دیدے گھما کر بات کرتی ہے اور بچوں پر چیختی ہے تو لگتا ہے کہ ساری بستی کو گالیاں بک رہی ہے۔ کتے تک تو اس سے خوف کھاتے ہیں۔ کیونکہ میں نے دیکھا کہ بھیڑوں کی رکھوالی کرنے والا امیر جب وہ بچوں کو ڈانٹتی ہے تو روٹی چباتے چباتے چپکے سے کھسک جاتا ہے۔"

میں زور سے ہنس پڑا۔ گاری خاں کو اپنی بندوق کے علاوہ ہر مؤنث سے چڑ ہے۔ بستی کی لڑکیاں اسے دیکھ کر اپنے ماتھے ڈھانپ لیتی ہیں اور تیز چلنے لگتی ہیں۔ اس کے گوپے کے قریب سے نکلتے ہوئے ڈرتی ہیں کہ دیوانہ ہے کسی دن بندوق

سے سر نہ اڑا دے۔ صرف مریم بے خطر اس سے باتیں کرتی اور جب وہ ہمیں ملنے آتا تو کہتی "چاچا گاری خاں سناؤ کوئی شکار مارا، کوئی خبر، کوئی نہیں"۔ شاید اسی لئے گاری خاں کہتا تھا کہ وہ شیرنی ہے۔

بیرن نے بارش سے بچنے کے لئے کوئی زیادہ بندوبست نہ کیا تھا۔ کہتا "مائی! کب سے ہم یہاں ہیں۔ آسمان دھلے دیدے کی طرح روز صاف اور دھوپ سے تپتا ہوا ہوتا ہے۔ بھلا برسات بھی کیا ایسی لگے گی کہ یہ مضبوط دوہری چھت والا گوپا ٹپکنے لگے۔ پانی تو ویسے ہی اللہ کی رحمت ہے اور پھر بستی کے لوگ ایسے بندوبست کر رہے ہیں جیسے کوئی آفت آنے والی ہو۔ بس ریت بھیگ جائے گی اور کیا ہو گا"۔

جب عبادت کرتے لوگوں اور خوشی سے منمناتی بھیڑوں۔ زور زور سے بھونکتے کتوں کو سنتا اور ساون کے بادلوں میں بجلی کے لہریئے سے روشن ہوتے ٹیلوں کو دیکھتا میں بیرن سے پہلے اندر آیا تو ایک کونے میں لکڑی کے شکنجے میں جلتا دیا سن سن کی آواز سے بجھتا لگتا تھا۔ اور پانی کے قطرے چھت میں لٹکتے تاروں والے کپڑے پر کڑھے ہوئے ستاروں کے برابر موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔ بھیڑوں کو سمیٹتے اور رنگ محل کے در و دیوار کو ننگا کرتے کرتے فرش گیلا ہو گیا تھا۔ سامان والے گوپے پر گاری خاں نے بوٹی ڈالی تھی اور وہ پہلے ہی بھرا ہوا اور مضبوط تھا۔ مگر اس میں دو آدمیوں کی جگہ نہیں ہو سکتی تھی، بیرن نور خاں کے

گھر میرے لئے پناہ کو پوچھنے گیا۔ سردار گھر پر نہیں تھا۔ وہ عیسیٰ کے زخمی ہونے کے بعد سے بہت کم مجھے ملا تھا۔ اکثر رکھنی میں رہتا اور آتا تو اپنے سَو کاموں سے اُسے اتنی فرصت نہ ہوتی کہ سوائے سلام دعا کے مجھ سے کوئی اور بات کر سکے۔ بلند خاں کا چھوٹا بیٹا باقی زخمیوں کے ساتھ پوسٹ پر تھا۔ اور اس کی آنکھوں میں اتھاہ نفرت دیکھ کر میں نے کبھی پوسٹ پر جا کر اُسے پوچھنے اس سے بات کرنے کی جرأت نہیں کی تھی۔

سردار کی بیوی نے کہا "سائیں رات یہاں ہمارے ہاں گزار لیں صبح تک۔ اللہ کرے گا کوئی نہ کوئی بندوبست ہو جائے گا۔"

جب میں بیرَن کے ساتھ اپنے گوپے سے نکل کر نور خاں کے ہاں جا رہا تھا تو بجلی چمکی اور بادلوں کی مہیب گرج سنائی دی اور پھر ساتھ تڑپ کر پھٹا اور میلوں تک ٹیلے اور بھٹ گوپے اور جانوروں کے گاوں پر نور روشن ہوا۔ اس روشنی میں مَیں نے پانی کو بھاگتے اور گلیوں میں سے گزر کر ڈھلوان راہ سے گوپے کی طرف جاتے دیکھا۔ بارش کی چادر موتیوں کی دھند کی طرح بستی کے گرد لپٹی ہوئی ہیں اور بیرَن دم بخود رہ گئے کیونکہ ہم میں سے کسی کا حوصلہ نہ ہوا کہ سانس بھی زور سے لے یا بول سکے۔

مریم برتنوں کے بوروں دودھ کے تھیلوں اور اناج کی بوریوں کے ڈھیر پر چھت کے قریب لیٹی ہوئی تھی۔ صرف اس کے پاؤں گھگھرے کی گوٹ میں سے دکھائی

دے رہے تھے اور یہ پاؤں دیئے کی ٹمٹماتی لو میں اتنے دودھیا اور روشن
لگے کہ بے اختیار میرا جی چاہا میں ان کو آنکھوں سے لگا لوں۔ نور خاں کی بیوی نے
اُسے آواز دے کر کہا کہ "نیچے اُتر کر سائیں کے لئے ایک اور کمبل بچھا دو۔" تو وہ
ہلی تک نہیں۔

سردار کی بیوی کہنے لگی "شاید سو گئی ہو گی، عجیب لڑکی ہے ابھی بیرن کے
آنے سے پہلے تک تو جاگ رہی تھی۔ شاید اسے شرم آ رہی ہو گی۔" اور خود ہی تہہ
کیے کمبل کو کھولنے لگی۔

برتنوں کے بوروں پر کروٹ بدلنے کی وجہ سے کھڑ کھڑ ہوئی اور دوسرے
لمحہ کود کر اُتری اور کمبل کا دوسرا سرا اینٹھ کر زمین پر پھیلا دیا۔ پھر ٹھلیا میں سے
اُنڈیل کر مٹی کی "منی" سی ٹھلیا میں سے پانی پیا پھر گلہری کی تیزی سے اونچے بوروں
پر چڑھ کر اسی طرح لیٹ گئی۔ اس کے پاؤں اگر چھپ نہ گئے ہوتے تو میں سوچتا وہ
وہاں سے ہلی تک نہیں۔ دیئے کی کمزور ہلتی ہوئی لو میں اس کے کُرتے پر گلے اور سینے
پر ٹکے موتی چمکنے اور سانس لیتے معلوم دیتے تھے۔ بجلی کا ایک کوندہ تھا کہ لپکا اور
میری آنکھوں کو چندھیا کر چھپ گیا۔

ساری رات مجھے نیند نہیں آئی۔ نامانوس جگہ میں عجیب طرح کی ہلی جُلی
خوشبوئیں میرے گرد گھومتی رہیں۔ مجھ سے چھپی ہوئی مریم کے پاؤں سے نکلتی روشنی
کی شعاعوں نے ہر شے کو رنگ دیا تھا۔ خشک دودھ کی میٹھی سی باس اناج کی سوندھی

سی بو۔ میرے قریب ہی کسی تھیلے میں لٹکے گڑ کی مٹھاس کا احساس سکھائے ہوئے
پھوگ کے پھولوں کی ہوا یا ہر ریت پر پڑتی بارش اور بہتے پانی پر سے آتی ہوئی
آوازوں سے بھری گوپے کے خوشبودار گھاس کے بنے پٹ کی سوگند۔ مجھے محسوس
ہوا میں کسی مندر میں ہوں، پردوں کے پیچھے مورتی ہے۔ مردنگم بجاتے پجاری باہر
کھڑے ہیں اور بھجن کے بول کوئی بار بار دہرا رہا ہے ۔ نت جاگن میریاں انکھیاں ۔

اپنے دوست سریندر سنگھ کے گاؤں میں گزاری راتیں مجھے یاد آ رہی تھیں۔
ساری رات کوئلیں کوہو کوہو بولتیں۔ آموں کے باغوں سے گھرے مکان میں کھیتوں
کے کنارے شہتوت کی میٹھی خوشبو سے مدہوش مکھیاں ہوا کے جھونکوں سے درخت
کے گرد جھولتی اور لہراتی ہوئی سیٹیاں بجاتی مکڑیاں فضا کو اپنے پروں کی چمک
اور رنگت سے بھر دیتی۔ شاخوں میں پھدکتی چڑیاں ڈال ڈال شور مچاتی اور ہوا
نمناک سی سوگوار کنواری کی طرح ہولے ہولے قدم دھرتی چلتی رہتی۔

سریندر سنگھ کی بستی ہوا سے بھرے گاؤں کی یاد مجھے ریتھال بستی میں اس رات
آئی جب صحرا کا جادو میرے رگ و پے میں سرایت کر رہا تھا۔ یہ ویرانہ صدہا صداؤں
سے آباد تھا۔ آج سے پہلے جو آنکھیں ہریالی اور ٹھنڈے کنجوں اور آسانیوں کی عادی
تھیں۔ اب ریت میں جوانی خوبصورتی اور زندگی ڈھونڈ رہی تھیں۔

ایسی ہی گزری بیتی باتیں سوچتے سوچتے جانے کب مجھے نیند آ گئی۔

رات کی رات میں خشک جھاڑیاں تازہ اور نکھر گئی تھیں۔ پانی سارا دن پڑتا رہا

بارش کبھی دُھند بن کر چھا جاتی اور کبھی موتی بن کر برسنے لگتی۔ میں اور بیرآن گھومنے
کے لئے باہر نکلے تو سردار کی بیوی نے بیرآن کو پکار کر کہا۔

"ایک دم رُکو میں بسریاں پکا لوں، غریبوں کا کھانا مالک نے کبھی کاہے کھایا
ہوگا۔"

ہم واپس آگئے۔ میں کھلے دروازے کے سامنے لکڑی کے ننگے تخت پر بیٹھ گیا
چھپر کے نیچے مریم لکڑیوں کے انگارے بنا رہی تھی۔ دھوئیں سے اس کی آنکھیں سُرخ
تھیں۔ اور چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ بھیگے کپڑوں میں اس کے جسم کے دلآویز خطوط جادو
سا کرتے لگتے تھے۔ کرتے کے دامن پر موتیوں کا سفیدہ سُرخی کے مقابلے میں بہت
گہرا تھا۔ چیزی کے بھیگے ہوئے ستارے ماتھے پر چپکے ہوئے تھے۔

سُنبل نے جو رنہال کی سب سے شوخ لڑکی تھی آگ دہکاتی ہوئی مریم کو کہنی
سے ٹھوکا دیا اور جب سردار کی بیوی دو روٹیوں کے درمیان گڑ رکھ رہی تھی تو سُنبل
نے آنکھ بچا کر ہمارے گوپے کی طرف اشارہ کیا۔ میں اوٹ میں ہو گیا۔ روزن میں سے
مریم کا چہرہ ہی میرے سامنے تھا۔ اس نے بڑی نفرت سے ناک چڑھا کر دونوں ہاتھوں
سے یوں اشارہ کیا گویا ہم کو دُور کرنا چاہتی ہو اور پھر زور زور سے لاتے کی لکڑیوں
کو پھونکنے لگی۔

بسری کا مزہ میرے منہ میں ریت کی طرح کرکرا تھا۔ میں نے آئینہ نکال کر بہت
غور سے اپنی شکل دیکھی۔ رنہال بستی میری نگاہوں کو ویران اور بے آباد سی لگی میں نے

سوچا اب میں پوسٹ پر ہی رہوں گا چاہے کچھ بھی ہو۔

زخمی قیدی بڑی اُداسی سے پتھروں کی قطار پر بیٹھے تھے۔ جب تک ان کے زخم بھرنے نہ لگیں انھیں بڑے شہر بھیجا نہیں جا سکتا تھا۔ ہمارا افسر بہت چوکس رہتا اور رات میں کئی دفعہ سپاہیوں کی ڈیوٹیاں بدلتیں۔

اس رات میں بستی کی طرف نہیں لوٹا۔ بارش تھم کر نکھری ہوئی چاندنی دھلے ہوئے ریت کے ٹیلوں پر پھیلی جیسے نئی بیاہی اپنے روپہلی جوڑے کو پہنے اتراتی ہوئی گھومنے نکلی ہو۔

بادِ شمال کے نرم نرم جھونکے بادلوں کو لاتے رہے کبھی کبھار سورج بھی اوٹ سے پُرانے دوست کی طرح مسکراتا ہوا دکھائی دے جاتا۔ میگھ ملہار سے روہی آباد ہو گئی صحرا، سبزے اور گھاس پھولوں اور خوشبوؤں سے پُر رونق ہو گیا۔ لائیاں لہکنے اور چٹکنے لگیں۔ پھوگ پر پھول تھے۔ بھاگ سُہاگ کا موسم آگیا۔ کبھی پورب سے ٹھنڈی ہوا آتی اور بادلوں کو ڈھکیل کر اپنی طرف لے جاتی۔ سیاہ جھکی ہوئی گھٹائیں۔ سفید پر سے ہوئے ہوا کے جھونکوں کے ساتھ اڑتے ہوئے جھنڈے اڑاتے بادلوں کو ڈھکیل کر پھر شمالی ہوا اپنی طرف لے جاتی اور گھپ اندھیرے میں بجلی کے لہریئے ان لشکروں کا بندوبست کرتے۔ تیز تیز اِدھر سے اُدھر چلتے پھرتے۔

جنڈی میں کانٹوں کے ساتھ پتے پھولوں سے بھی نرم و نازک لگ رہے تھے کھپ کے سفید بوٹے پر جوبن تھا۔ ہر شے زندہ ہو رہی تھی۔ لوگ خوش خوش پھر رہے

تھے۔ نہائے ہوئے جانوروں کے بدن چمک رہے تھے۔

بہت دنوں بعد بارش تھمی اور دھنک نکل آئی۔ ساتوں رنگوں کے بینگ آسمان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک لٹکی ہوئی تھی۔ صحرا کی دلہن کے بھولنے کے لئے اس کے سسرال سے تحفہ آیا تھا۔

نورتاں کی بیوی آنگن میں ہمسایوں سے باتیں کر رہی تھی "یہ بارش ہمیں تو آباد کر گئی۔ پر عیسیٰ کے زخم بھرنے میں ابھی بہت دن لگ جائیں گے۔ میں اُسے دیکھ کر آئی ہوں۔ ظالموں نے یوں تاک کر ٹانگ میں گولی ماری ہے۔ مریم بیچاری اس کی منگیاں سہیلیاں سب خوش پھریں گی اور یہ اداس رہے گی۔ اگر اس دن آندھی نہ آئی ہوتی تو اب تک اپنے گھر کی ہو گئی ہوتی۔ میرے سر سے بوجھ اُتر چکا ہوتا۔"

میں نے دل کو سمجھایا تھا زندگی میں ہر عورت تمہاری طرف توجہ نہیں دے سکتی۔ اس لئے مریم کی پرواہ کیوں کرتے ہو۔ اور اب آبادی تھی۔ اس شادمانی اور دوبارہ جی کر اٹھنے کی خوشی میں جب بوٹا بوٹا خوش ہو رہا تھا تو میں کیوں خوش نہ ہوتا۔ پوسٹ پر سپاہی خوش تھے اور جشن منانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ میں بھی بستی لوٹ آیا۔

ساری دوپہر میں گوپے میں لیٹا باہر ہونے والی تیاریوں کو دیکھتا رہا۔ فراٹے بھرتی ہوئی بھیگی ہوئی خوشبودار نمی کو لئے چل رہی تھی۔ زمین اور نئے سبزے اور بوٹیوں کی باس جو پانی کے گوپے پر سے آنے کی وجہ سے بھیگی ہوئی بہت خوشگوار تھی۔

بلند خاں کا چھوٹا بیٹا نئی رُت کی مبارکباد دینے سردار کے ساتھ ہی آیا تھا۔ اور اب اسی کے ساتھ ٹیلوں پر بھاگتا پھرتا تھا۔ وہ جگہ جگہ ہونے والی خوشی کے لیے بندوبست کرتے پھرتے تھے۔ صبح سے نقارے بج رہے تھے اور عید کا سماں تھا۔

میلے کی شام بڑی حسین اور رنگین تھی۔ عورتوں نے اپنے گوٹے ہوئے اور پرانے زیوروں کو نکالکر دھویا تھا۔ کبھی کبھار شادی بیاہ پر پہننے والے جوڑے پہنے تھے اور ڈھلی شام سے ہی سجنے بننے میں لگی تھیں۔

نور خاں کی بیوی نے مینڈھیاں کی تھیں اور انھیں موم سے چمکایا تھا۔ آنکھوں میں کاجل کی دھار کٹاری کی طرح بنی تھی۔ ماتھے پر سُرخ بندیا سجائی، آنکھوں کے کونوں میں سُرخ ٹیکے لگائے اور دُم دار کاجل کی نوک کو سرخی میں ڈبویا۔

گلی جہاں ختم ہوتی ہے وہاں سے آگے ٹیلہ تھا اور ٹیلے کے سرے سے گوپے کی ڈھلوان شروع ہوتی تھی جس پر پھولوں والی جھاڑیاں تھیں۔ ٹیلے کے دوسری طرف کھیت ہے جس کا رخ بھی اوندھے ہو جانے والے تختے کی طرح آہستہ آہستہ ڈھلوان سے ہوتا گوپے کی طرف جاتا ہے اور اسی ٹیلے پر سیدھی جگہ میں رنہال بستی کی برسات کا میلہ لگنے والا تھا۔

دوسری بستیوں سے آئی ہوئی عورتیں سیاہ آنکھوں کو کاجل کی دھار سے سجائے بڑے بڑے گھاگھروں پر موتیوں سے بنی اور شیشوں سے مڑھی کرتیاں پہنے ستاروں والی چُنریاں سَر سے پُشت تک پھینکے پھر رہی تھیں۔ ان کے گلے میں کٹمالے

اور چندن ہار سہج سہج ہلکورے لے رہے تھے۔ ناک میں تولے اور لیچے مینڈھیوں
میں گندھے بینے چاندی کی پٹڑیوں میں پروئے ہوئے۔ جب ڈھلتی دھوپ بینے
میں اپنا عکس ڈالتی تو ہر طرف چکا چوند ہو جاتی۔ ان پر نظریں نہیں ٹکتی تھیں۔ نئی
دلہنوں نے چاندی کی جوڑیاں کہنیوں تک بھرے ہوئی تھیں، بازوؤں پر بہنوٹے
جن کے رنگین دھاگوں کے پھندنے چولے کے دامن کو چھوتے ہوئے۔ بالیوں کے
وزن سے کان لٹکتے ہوئے۔ نئی چاندی کی تختیوں سے گلے بھرے ہوئے، ٹخنوں میں
بیر اگوڑے کہ چلنے میں چھن چھن کی صدا آتی۔ پاؤں کی انگلیوں میں چھلے کہ اس کی زنجیر
مہندی کے مقابلے میں جیسے برف اور سرخی کو ملا کر رکھ دیا جائے

پھٹے پر دکانیں سجی تھیں جنہیں بستی کے جوان اپنے دل کی خوشی اور نفع کے خیال
سے چلا رہے تھے۔ رنگ اور ہستی، چمک اور خوبصورتی کا ایک طوفان تھا کہ ٹولیاں
بنا کر جوانوں اور بڈھوں کے ہوش گم کیے دیتا تھا۔ دوکاندار مستی لگے ہونٹوں اور
بندیا کے نیچے چمکتے رخساروں کو دیکھتے دیکھتے بھاؤ چکاتے اور خرید سے کبھی کم دام پر
ایک نظر کے بدلے شہ بیچ دیتے۔

ہمارے وہ سپاہی جنہیں چھٹی مل سکی تھی میلہ دیکھنے آئے تھے اور اب گھوم رہے تھے۔
کنواری لڑکیاں سادہ کپڑوں میں دلفریب لگتی تھیں اور جوانوں کے ٹولوں سے
پرے اپنی ہنسی اور باتوں میں لگی تھیں۔ پچھلی رت کی بیاہی ہوئی سہیلیاں
اپنے ننھے بچوں کو اٹھائے شرمائی شرمائی سی دولہا کی باتیں کرتیں۔ اس میلہ میں اونچے

سے لے کر لڑکیوں تک کے سودے ہو رہے تھے۔ لڑکیاں جو باپ کی جائیداد ہوتی ہیں جنہیں خریدا جا سکتا ہے، بیویاں جنہیں بیچا جا سکتا ہے، کنواریاں جن کی بولی ہوتی ہے، بھائی جو بہن کے بدلے دلہن مانگتے ہیں۔ رُوہی کا سارا حُسن سمٹ کر رنہاں کے اس میلہ میں رنگوں کے ناٹک کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ رنہاں رنگ، ہجوم تھی کہ اس پر لحظہ لحظہ منظر بدلتا تھا۔ اور لڑکیوں کی قسمت کے فیصلے ہو رہے تھے۔

میں نے سوچا میں ان سب سے بڑھ کر بولی دے سکتا ہوں کیوں نہ میں بھی مریم کے باپ سے کہوں۔ عیسیٰ بیمار تھا اس کی ٹانگ میں ناسور ہو گیا تھا۔ بلند خاں نے اپنی پونجی بیچ دی تھی۔ غریب کے پاس دولت ہی کتنی ہوتی ہے۔ مال مویشی کی دیکھ بھال کرنے کے لئے عیسیٰ کا بھائی ابھی کم عمر تھا۔

اس گھڑی میں مَیں نے مریم کو دیکھا وہ گلی کے سرے پر کھڑی تھی اور سنبل کے ساتھ ہنستی ہوئی آنے جانے والوں کو مذاق کرتی اور تربوز کے بیج کھا رہی تھی اس نے اپنے جہیز کی چنری سر پر کی تھی۔ اس کے ساتھ اس کی پرانی سہیلیاں تھیں انھوں نے گلی کا راہ روک رکھا تھا اور جب جی چاہتا گانے لگتی تھیں۔

نور خاں کو میں نے بتیوں کی روشنی سے اندھیرے میں آتے ہوئے پکڑ لیا۔

"مریم مجھے دیتے ہو! بولو جو کہو گے وہی دوں گا۔ جو مانگو گے وہی پاؤ گے تمہاری بیٹی ہر قیمت پر سستی ہے۔"

نور خاں میرا ہاتھ پکڑ کر احاطے میں لے آیا۔

ہمارے سامنے اور ہم سے اونچے ٹیلے پر میلہ اور ناچ اپنی پوری رونق پر تھا۔ چاند کی روشنی بہتی ہوئی ہوا کے ساتھ گھٹتی اور بڑھتی لگتی تھی۔ جوانوں کی ٹولیاں شراب پی کر بہک رہی تھیں۔ کنواری لڑکیاں ڈری ڈری اپنی ساتھیوں سہیلیوں کے ساتھ کھڑی گیت گا رہی تھیں۔ نقارے زور زور سے بج رہے تھے۔

نور خاں نے کہا "سائیں کل یہ میلہ ختم ہو جائے گا۔ یہ ٹیلہ بے آباد ہو جائیگا ہم لوگ اپنی زندگی کے پرانے راستے پر لوٹ آئیں گے۔ آپ نے آج بہت بڑھیا شراب پی ہو گی۔ اور جب آدمی شراب پیئے اور رات چاندنی ہو، ہوا ٹھنڈی ہو اور ڈھول مسلسل بج رہا ہو تو اسے خراب چیزیں بھی اچھی دکھائی دینے لگتی ہیں آج تو بدصورت سے بدصورت عورت پر بھی جوبن ہے۔ میری مریم کو کیا آپ نے آج ہی دیکھا ہے؟ مہینوں سے آپ یہاں رہ رہے تھے۔

میں خاموشی سے میلے کی رونق کو دیکھتا رہا۔ میں نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔

نور خاں پھر کہنے لگا "سائیں آج اُمرا یہاں ہوتا تو میرے لئے آپ کے سوال کا جواب دینا مشکل نہ ہوتا مگر وہ یہاں نہیں ہے اور اس نے اپنی بہن کے دماغ میں یہ ڈال دیا ہے کہ کوئی اسے بیچ نہیں سکتا۔ ہمارا یہ رواج نہیں کہ ہم بیٹی کا سودا کرتے ہوئے اس کی صلاح بھی لیں۔ پھر علیٰی خاں بھی بیمار ہے اور حرکت

کہتا ہے کہ اس کی زخمی ٹانگ اگر کاٹ دی جائے تو شاید وہ بچ جائے گا۔ میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ ایک لنگڑے آدمی کے ساتھ میری بچی کی زندگی خراب ہو۔ مگر سائیں آپ تو بادشاہ ہیں آپ مریم کا کیا کریں گے۔ وہ ایک گنوار بستی کی گنوار لڑکی ہے۔ جب آپ کا دل یہاں سے بھر جائے گا اور آپ چلے جائیں گے تو محلوں کی رونقیں وہاں کی خوبصورتی آپ کے ذہن سے اس کا خیال بھی مٹا دے گی۔ وقتی طور پر آپ مریم کو چاہتے ہیں۔"

وہ چپ ہو گیا۔

میں نے کہا "نور خاں میں نے بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے۔ میں مریم کو چاہتا ہوں اگر تم اپنی لڑکی مجھے دے دو تو میں ساری عمر اس سے محبت کرتے رہنے کا دعدہ کرتا ہوں۔"

نور خاں نے کہا "سائیں ہمارے یہاں عورت سے محبت کرنا اور ساری عمر محبت کرنا کوئی ضروری نہیں۔ اسے آپ کو دینے میں میں یہ شرط نہیں رکھتا۔ عورت تو خرید و فروخت کی ایک شے ہے۔ چاہے ہم بچیوں کو کتنے پیار سے پالیں انھیں جگر کے ٹکڑوں سے زیادہ عزیز رکھیں پر آخر تو انھیں پرائے گھر جانا ہوتا ہے وہاں اگر ان کا نصیب اچھا ہوتا ہے تو ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا جاتا ہے۔ عورتیں بھی خاموش گایوں کی طرح اس سے زیادہ کچھ نہیں مانگتیں۔

میں نے کہا "نور خاں میں مریم کو زندگی کو ہر شے سے زیادہ عزیز رکھوں گا۔

امر آیا کہ تم منا لینا اور جو تم چاہو گے میں اس کے بدلہ میں تم کو وہی دوں گا۔ بولو منظور ہے"

نور خاں نے سر جھکا لیا اور کہا "سائیں آپ مانگیں اور میں کسی شے سے انکار کر سکوں۔ آپ میرے مہمان ہی نہیں میرے مالک بھی ہیں"

میں نور خاں کو وہیں بیٹھا چھوڑ کر سیٹی بجاتا ہوا احاطے کی باڑ پھلانگ کر ٹیلے کی طرف بھاگا۔ گلی کے نکڑ پر میں نے مریم اور اس کی ایک اور سہیلی کو عمر خاں کے ساتھ باتیں کرتے پایا۔ وہ روشنی میں تھیں اور میں چاند کے جھک جانے اور گوپوں کی قطار کی وجہ سے اندھیرے میں تھا۔

عمر خاں کہہ رہا تھا "بھابھی اگر تم بھائی کو دیکھو تو بس تم رہی دو دہ سوکھ کر کانٹا ہو گیا ہے۔ تمہیں یاد کرتا ہے۔ مجھ سے کہتا تھا مریم کو کہنا اگر اس صبح تم غصے سے چلی نہ جاتیں تو شاید میں زخمی نہ ہوتا"

مریم سسکیاں لے کر رو رہی تھی۔ اس کی سہیلی اسے سنبھال رہی تھی۔

میں الٹے قدموں اسی طرح اندھیرے کا سہارا لے کر گوپوں کی اوٹ میں ہوتا ہوا دوسری طرف سے ٹیلے پر نکلا۔ میری خوشی میں گھلا ہوا زہر میری رگوں میں پھٹنے والی آگ کی طرح تھا۔ روشنی میں مجھے رونق اجڑی اجڑی اور میلہ پھیکا پھیکا سا لگا۔

آدھی رات گئے پیچھے ناچ شروع ہوا۔ ادھیڑ عمر کی عورتیں اور مرد ناچنے اور بھونرے چکروں میں گھومتے رہے پھر لڑکیوں اور جوان ہوتے ہوئے لڑکوں کی باری آئی۔

پیرآن میں اور پوسٹ سے آئے ہوئے سپاہی دائرہ بنا کر کھڑے تھے اور ناچ دیکھ رہے تھے۔ اور تالیاں مارتے جاتے تھے۔

ایسی رُت میں جب مستانی ہوا چل رہی ہو جوان لڑکوں کا بیکار کھڑے رہنا بدشگونی ہے۔ گاری خاں نے مجھے ناچنے والی لڑکیوں کے دائرے میں ڈھکیل دیا۔ دائیں بائیں گھومنے اور تال پر سُر مارتے ہوئے جب ہاتھوں پر ہاتھ مارنے کی باری آئی تو میرے سامنے مریم تھی وہ اور لڑکیوں کی طرح سیدھا میری آنکھوں میں نہیں دیکھ رہی تھی۔ اور بے حد اداس لگتی تھی۔ لوگ زور زور سے گاتے اور ہنستے ہوئے گھوم رہے تھے۔ میں نے باتیں شروع کیں۔

میں نے کہا "تم جی لگا کر کیوں نہیں ناچتیں ؟"

کہنے لگی "تمہیں خود ناچنا نہیں آتا۔ باتیں مت کرو تال پر ہاتھ بیر نہیں مار سکو گے۔"

تھوڑی دیر بعد میں نے خود کہا "تم مجھ سے خفا کیوں ہو۔"

کہنے لگی "تم میرے کون ہوتے ہو کہ میں تم سے خفا ہوں۔"

میں نے کہا "تمہارے باپ نے تمہاری منگنی مجھ سے کر دی ہے۔"

اس نے بڑی گہری نظروں سے جن میں انتہائی بے یقینی تھی سیدھا میری آنکھوں میں دیکھا اور پھر خاموشی سے میرے ساتھ جھومر کے چکر دوں میں شریک ہو گئی۔

یہ مریم کی اور میری پہلی گفتگو تھی۔

اس کی شان دلربائی اور اس کی اداؤں نے مجھے دیوانہ بنادیا تھا۔ اس رات میں وہ اپنا بہترین کوڑیوں اور موتیوں سے بھرے کام کا کرتہ اور چالیس گز کا گھاگرہ پہن کر آئی تھی۔ اس نے جہیز کے لئے رکھے کپڑوں میں سے بھاری ستاروں اور سونے کے رنگ کے ملیے نگوں کے کنارے والی چنری سر پر اوڑھی تھی۔ اور موم پھیر کر بالوں کو جمایا تھا۔ اس رات اگر کوئی فرشتہ بھی ہوتا تو اس کے دیوں کی لو سے زیادہ چمکتے چہرے پر فدا ہو جاتا۔ اس کی وہ نگاہ جس میں بے یقینی تھی میرے دل کے پار اتر گئی۔ میں اسے اپنے آپ کا یقین دلانا چاہتا تھا۔ میں اسے حاصل کرنا چاہتا تھا۔

پھاگ سہاگ کا موسم آگیا تھا۔ کھمیاں اکٹھی کرنے کے لئے جب مریم اور اس کی ماں جانے لگیں تو میں نے نور خاں سے کہا میں بھی ان کے ساتھ جاؤں گا۔ ٹھنڈی ہوا کی بھیگی ریت پاؤں کے نیچے ریشم کی طرح نرم لگتی تھی دور دور تک ٹیلے سفید ہو رہے تھے۔ لڑکیاں پچھلے سال کی کھمیاں لیے جھکی ہوئی کام میں لگی تھیں۔ نرم دھوپ میں ان کے جسم کے خطوط اور ان کے لہنگوں کے کنارے بڑے خوبصورت لگتے تھے۔ میں نور خاں کی بیوی کے ساتھ ساتھ تھا پھر باتیں کرتے ہوئے وہ دوسری عورتوں کے پاس رک گئی۔ میں ایک ٹیلے کی اوٹ میں ہو کر مریم کی طرف آگیا اس نے میری طرف گردن موڑ کر دیکھا اور

کہنے لگی" تم ایسا کام کیوں کرتے ہو جس میں نہ تمہارا جی ہے اور نہ مرضی۔

میں نے کہا" مریم تم میرے ساتھ شادی کرنے کے لئے تیار ہو کہ نہیں؟"

تمہارے چہرے سے لگتا ہے کہ تم خوش نہیں۔"

مریم نے کہا" تمہیں ناپسند کرنے کی تو کوئی وجہ نہیں، اور تم مجھے اچھے بھی نہیں لگتے۔"

وہ پھر بے دھیان سے کام میں لگ گئی۔

دوپہر کو دھوپ بدن پر چیونٹیوں کی طرح رینگنے لگی تو ہم لوگ ایک ٹیلے کے سائے میں آ گئے۔ سردار کی بیوی نے رومال میں بندھی میٹھی روٹیاں نکالیں اور لسی کا دونا بھر کر مجھے بھی دیا۔ لسی میٹھی اور مٹی کے برتن میں ہونے کی وجہ سے ٹھنڈی تھی۔ سنبل بھی ہمارے ساتھ آ کر شامل ہو گئی۔

دونوں لڑکیاں اب میری موجودگی میں ایک دوسری سے بہت کم بات کرتیں۔ مریم کے چہرے سے ناخوشی کا بھی اظہار نہ ہوتا اور نہ ہی خوشی کا۔ اس کے اور میرے درمیان فاصلے کم نہیں ہو سکے تھے۔ سنبل نے کہا" مریم ذرا ادھر تک چلتی ہو۔ نورن کو ملنے آئیں گے۔ کئی دنوں سے اسے نہیں دیکھا، سنا ہے اس کا بچہ بیمار ہے۔"

وہ لپک کر اٹھی اور سنبل کے اٹھنے سے پہلے ہی تیر کی طرح اس موڑ کی طرف چلنے لگی۔ اس کا سر اٹھا ہوا اور کندھوں پر بڑا خوبصورت لگتا تھا۔ چاندی کی بالیوں

سے بھرے کان اور سیاہ بالوں کی مینڈھیاں ماتھے کو دلفریب بنا رہی تھیں وہ سراپا حُسن تھی اور اپنے حُسن سے واقف بھی۔ جب تک وہ میرے پاس تھی میں اِرد گِرد سے بے نیاز تھا۔ اور جب وہ دوسرے ٹیلے کی طرف چلی گئی تو میں نے دیکھا کہ جھاڑیاں پھولوں سے بھری تھیں۔ جنڈ اور کریہہ کے سبز پتوں میں سے پانی چھلکتا لگتا تھا۔ لائی اور پھوگ پر بہار تھی۔ چھوٹی چھوٹی لالیاں پودوں کے جھنڈ میں اچھل رہی تھیں۔ کاونیاں چہک رہی تھیں۔ لگتا تھا بوٹے بوٹے سے سیکڑوں تانیں اٹھ رہی تھیں۔ راحت اور خوشی سے زمین تا آسمان ہر شے پر پیار رنگ تھا۔ ٹیلوں پر ذرا ذرا سی ہریالی پھوٹ رہی تھی۔ بھیڑیں طمانیت اور مسرت سے چرتے چرتے گردن اٹھا کر ممیاتیں اور پھر سر ڈال دیتیں۔ ہر شے ربِّ جلیل کی بنائی اس بے پناہ خوبصورتی اور خوشی کا شکریہ ادا کرتی۔

جھاڑیوں کے جھنڈ میں ٹوبے میں بھرا پانی ہوا کی لہروں کے ساتھ ساتھ لہریں مار رہا تھا اور ٹیلوں کا سایہ ٹھنڈا سکون بخش تھا۔ مردہ زمین آباد ہو گئی تھی۔ ہو سکتا ہے میرا دل بھی آباد ہو جائے ۔۔۔ مگر مریم کی بے رخی اور بے پرواہی دیکھ کر یہ خواب بڑا کٹھن لگتا تھا۔

مریم اب رات دن کام میں لگی رہتی۔ گایوں نے دودھ زیادہ دینا شروع کر دیا تھا اور دن ڈھلے وہ دودھ دوہنا شروع کرتی تو شام کو جا کر فارغ ہوتی۔ رات کو دونوں مل کر اسے گرم کرتیں۔ کبھی ماں دودھ گرم کرتی اور مریم

احاطے میں سے لانے کے ڈھیر گھسیٹ کر لاتی اور انھیں گڑھے میں ڈال کر آگ لگاتی کہ روٹی پکائے۔ نتھری اور ڈھلی ہوئی شام نیلے دھوئیں سے بھر جاتی۔ لمبی آوازوں سے اور ٹھکانوں پر آتے جانوروں کے گلے میں پڑی گھنٹیوں سے نکلنے نغموں سے بھر جاتی۔ شام کو جھاڑیوں کے جھنڈیوں میں چڑیاں شور مچاتیں اور بسیرا کرتے ہوئے کوّے اتنے زور سے بولتے۔ پھر بھانوں میں سے بھیڑوں کے ممیانے، کتوں کے بھونکنے اور گایوں کے ڈکرانے کی صدائیں ہولے ہولے خاموش ہو جاتیں۔ کنواریاں کاموں سے نپٹ کر چاندنی میں پھٹ پر اکٹھی ہوتیں۔ اور مل کر لمبی تانوں والے برہا کے گیت گاتیں۔ جن میں کسی فرضی محبوب سے بچھڑنے اور ملنے کا رنج اور خوشی ہوتی۔

گاری خاں اب سارا دن جنگلوں میں مارا مارا پھرتا۔ شام کو کبھی واپس آتا اور کبھی رات گئے شراب کے نشے میں دھت احاطے میں لڑکھڑاتا ہوا بیرن کو آوازیں دیتا گھستا۔ وہ اب مجھ سے کبھی مریم کی بات نہ کرتا۔ میں نے ایک آدھ بار اس سے بات کرنے اور اپنی خوشی میں اسے شریک کرنے کی کوشش کی تو اُسنے کہا۔

"سائیں دنیا میں سب سے مقدس ہستی بیوی ہے۔ آپ اس سے نکاح کرنے والے ہیں۔ میں نہیں چاہتا میں اب اس کا نام اپنے ناپاک ہونٹوں پر لاؤں۔ وہ تو اب بڑے قیمتی راز کی طرح آپ کی ہونے والی ہے۔"

اس کے بعد کبھی میں نے اس سے مریم کی بات نہیں کی۔ میں بیرن سے بھی یہ بات

نہیں کر سکتا تھا۔ مگر اندر سے میرا دل بے یقینی کا شکار ہوتا رہتا۔ میں چاہتا تھا کوئی ایسا ہو جس سے میں اپنی اس بے یقینی کا ذکر کر سکوں۔ کسی سے صلاح لے سکوں کسی کو اپنی اس خوش قسمتی کے راز میں شریک کر سکوں مگر اس پرائی بستی میں کوئی بھی میرا نہ تھا۔ دیوانہ کرنے والے اس موسم میں جب کہ ہر شے پر بہار آئی ہوئی تھی میرا دل اندر ہی اندر دھنسنے والے ساحل کی طرح تھا۔ بہت سوچ بچار کے بعد میں نے شکیل سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔

بلند خاں بہت گھبرایا ہوا رکھنی سے اپنی اونٹنی پر سوار آیا تھا۔ احاطے کے پاس اس نے نور خاں کو پکارا۔ میری آنکھ ابھی لگی ہی تھی۔ روزنوں میں سے پھولوں کی خوشبو سے بھری ہوا سیٹیاں بجاتی آ جا رہی تھی اور میں ایک بہت سہانا خواب دیکھ رہا تھا۔ خواب جس میں مریم نے زعفرانی رنگ کا کیسری جوڑا پہنا ہوا تھا اور زیوروں سے لدی ہوئی تھی۔ پھولوں کے ہاروں سے آنکھوں میں خوابوں کی پرچھائیاں ڈولتی ہوئی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اس سہاگ رنگ کو دیکھنا چاہا ہی تھا کہ احاطہ آوازوں سے بھر گیا۔ گلی میں لوگ بلند خاں کی اونٹنی کے گرد اکٹھا ہونے لگے۔ نور خاں شاید کسی ٹیلے کی طرف گیا تھا۔ وہ بیمار بھیڑوں کا واحد معالج تھا اور اس کچے موسم میں جانوروں کو کئی بیماریاں ہو جایا کرتی ہیں۔ بیرتی نے باہر نکل کر کہا۔ "گھر میں کوئی بھی نہیں ہے۔"

بلند خاں نے کہا "بیٹھنے کا وقت نہیں ہے ورنہ میں ان کا انتظار کرتا۔ میرے

خاں کی ٹانگ کاٹنے کے لئے کل جراح آنے والا ہے۔ مجھ اکیلے میں اتنی ہمت نہیں کہ یہ سارا تماشا دیکھ سکوں۔ میں کہیں جا رہا ہوں اس کی تکلیف نہیں دیکھ سکتا نور خاں سے کہنا وہ رکھنی چلا جائے۔ امرایا خاں بھی وہیں پر ہے۔ آدمی اپنی خوشبوں میں دوسروں کا رنج و غم کیسے بھول جاتا ہے:۔

اگلے دن نور خاں اور اس کی بیوی رکھنی چلے گئے۔ مریم ہستبل کے ساتھ گھر میں اکیلی رہ گئی۔ میرا دل اتنا بجھا بجھا اور اداس تھا خدا جانے کہ عیلی خاں بچے کہ نہیں۔ وہ ابھی زندگی سے بھرپور تھا اور جوان تھا۔ اس کے دل میں کتنی آرزوئیں کتنی امیدیں ہوں گی۔ اس نے کیسے کیسے مریم کے خواب نہ دیکھے ہونگے۔

موسم مجھے بے رنگ اور بے کیف لگنے لگا۔ باہر ویرانے میں بہار آئی ہوئی تھی۔ پر خنکی کا گمان ہوتا ہے۔ اب دن اتنے لمبے نہ رہے تھے۔ شام جلد ہی رات میں بدل جاتی۔ راتیں ذرا ٹھنڈی ہو گئی تھیں اور ٹیلوں پر دور دور تک بستی کی عورتوں نے ٹاک پر دودھ سوکھنے کے لئے پھیلا رکھا تھا۔ پھوگ کے پھولوں کو سکھانے کے لئے اکٹھا کر رہی تھیں۔

کریں سرخ پھولوں سے بھر گئے تھے۔ جنڈی سبز ہو گئی تھی۔

ٹوبے میں پانی تھا۔ مویشی چکنے بدن والے اور تندرست تھے اور سایوں میں سکون اور ٹھنڈک تھی۔ عورتیں ٹوبے کے کنارے جھاڑیوں کی اوٹ میں رنگ برنگ کے کپڑوں سے کھلونے بنانے میں لگی تھیں۔ ان کی باتیں بے پناہ

ہنسی میں بڑی جان تھی۔ کمبلوں کے لئے اون کو کاٹتے ہوئے وہ بڑے پیارے گیت گاتیں اور ایک دوسرے سے چہلیں کرتیں۔

شام کو میں نے پیرن سے کہا کہ "میں سُنبل سے ٹوبے کے پاس ملنا چاہتا ہوں۔ اُسے کہو کہ وہاں آ جائے۔"

چرواہے گھروں کو گیت گاتے لوٹ رہے تھے اور تازہ دودھ کی خوشبو بستی کے ہر گھر سے اٹھ رہی تھی۔ کنواری لڑکیاں چوڑا بہنے کاموں میں لگی تھیں۔ میں ٹوبے کے پاس اوٹ میں ٹہل رہا تھا اور سُنبل کا انتظار کر رہا تھا۔

"سائیں آپ نے بلایا تھا۔" وہ جھاڑیوں کی دیوار کو ہٹا کر آتے ہوئے بولی۔

میں نے کہا "ہاں میں نے بلایا تو تھا مگر اب سمجھ میں نہیں آتا تمہیں کیا کہوں۔ مریم کی اور میری منگنی نور خاں کی مرضی سے ہو گئی ہے۔ مگر مجھے لگتا ہے وہ خوش نہیں ہے۔ میں اور کسی سے پوچھ نہیں سکتا۔ کیا تم بتا سکتی ہو کہ وہ کیوں خوش نہیں کیا علی خاں سے محبت ہے؟"

سُنبل نے شام کے بڑھتے اندھیرے میں اپنی آنکھیں اُوپر اٹھا کر اِس بے یقینی سے مجھے دیکھا۔ جھاڑیوں میں جگنو روشن تھے اور سورج کی لالی ٹوبے کو خون کے رنگ سا سرخ کر رہی تھی۔ نیلا دھندلکا سفید پودوں ٹیلوں اور پھولوں کے جھنڈوں پر اتر رہا تھا۔ پھر کہیں پپیہا زور سے بولا اور کوئل کی دردناک آواز قریب ہی جال کی شاخوں میں سے سنائی دی۔ میں نے کہا "سُنبل جواب کیوں نہیں دیتی

دیتی ہو کیا مریم کو عیسیٰ خاں سے محبت ہے۔

اس نے مڑ کر ٹوبے کی طرف دیکھتے ہوئے جہاں پانی انگاروں کے رنگ کا ہو رہا تھا کہا "روہی میں لڑکیاں محبت نہیں کیا کرتیں۔ آپ اب یہ کیوں جاننا چاہتے ہیں۔"

"اچھا کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں مریم سے بات کر سکوں۔"

"ہاں آج رات آپ ہمیں اس بڑے ٹیلے کے پاس ملیں۔" اور یہ کہہ کر وہ چھلاوے کی طرح جھاڑیوں کی اس دیوار سے پرے غائب ہو گئی۔

میرا دل یقین اور بے یقینی کے درمیان شکنجے میں کسے ہوئے جسم کی طرح دکھتا اور ٹوٹتا معلوم ہو رہا تھا۔ میں رات کے ایسے وقت جب لڑکیاں بھٹ پر ناچ رہی تھیں اور جھوم کر گیت گا رہی تھیں اکیلا ٹیلے کے قریب دم سادھے ان کا انتظار کر رہا تھا۔

ناچنے والیوں کا شور بڑھ گیا تو میں نے ان دونوں کو دیکھا۔ سُنبل آگے آ گئی تھی اور مریم اس کے ایک قدم پیچھے مگر اس سے نکلتے ہوئے قد کی۔ اس نے شرم سے دوہری ہو کر اپنا منہ نہیں چھپایا۔ وہ اپنی چنری کے پلو کو اپنی انگلیوں پر نہیں لپیٹ رہی تھی۔ وہ کھڑی میری طرف بیٹھ گئے نہیں بس یونہی ٹیلے پر دیکھ رہی تھی۔ سُنبل نے کہا "مریم میں ابھی آتی ہوں تم یہاں کھڑی رہو۔" اور وہ ٹیلے کی چڑھائی پر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

مریم ایک دم گھومی اور سیدھا میری آنکھوں میں دیکھتی ہوئی بولی۔" کیا کہنا ہے کیا پوچھنا ہے؟"

میں نے کہا "تمہیں یہاں آنا برا لگا ہے تو جا سکتی ہو۔"

ذرا نرم پڑتے ہوئے کہنے لگی۔" بلایا تھا آگئی۔ نہ اچھا لگا ہے نہ برا۔"

میں نے کہا "مریم میں تمہیں برا بھی نہیں لگتا اور اچھا بھی نہیں۔ کیا تم کسی سے محبت کرتی ہو؟"

وہ بڑی دلچسپی اور حیرت سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

"ہم روہی کی لڑکیاں صرف پیار کرتی ہیں جو سب سے زیادہ بولی دے وہ لے جاتا ہے۔ محبت کرنا ہم شادی کے بعد سیکھتی ہیں۔"

میں نے کہا "مگر میں اپنے سوال کا جواب چاہتا ہوں۔ میں اپنے دل کی بے یقینی دور کرنا چاہتا ہوں۔"

پھر اس لمحے کی چکاچوند مجھے آج تک سمجھ میں نہیں آئی۔ نیلے آسمان سے بجلی کا کوندہ لپکا اور مجھے چھو کر نکل گیا۔ ایک پل جیسے نور سے سارا جہاں منور ہو اور نئے سیرے میں گھر جائے۔ ہونٹوں پر خون میں جسم سے پھوٹتی گرمی اور آگ کی وجہ سے میں نے جانا کہ میں موت کے کناروں سے لوٹا ہوں۔ پسینے میں نہایا کانپتا ہوا میں ٹیلے کے سائے میں بیٹھ گیا۔ میری ٹانگیں اس ایک ساعت کی خوشی اور مکمل پن کا بوجھ سہارنے سے عاجز تھیں۔ مریم مجھ سے محبت کرتی تھی۔ گنگناتی رہی ہوں

سے جب میں لوٹا ہوں تو بیرن اور گاری خاں کسی گرما گرم بحث میں الجھے ہوئے تھے۔ امر آیا احاطے میں بیٹھا مریم اور سنبل سے باتیں کر رہا تھا۔ جراح نے کہا تھا کہ وہ ٹانگ کاٹنے سے پہلے اپنا آخری علاج علیے خاں پر آزمانا چاہتا ہے۔ نور خاں اور اس کی بیوی رکھنی سے کل صبح لوٹنے والے تھے۔ وہ اس صبح کے بعد سے پہلی بار ایک رشتہ دار کی حیثیت سے مجھ سے ملا تھا۔ مگر اس کے انداز میں اتنی سرد مہری تھی کہ میں اس کی طرف سے مایوس ہو گیا۔ شاید اُسے میں پسند نہ تھا۔ وہ اپنے دوست علیے خاں کو مجھ پر ترجیح دیتا تھا۔ شاید وہ مجھے امیرزادہ سمجھ کر اپنے سے اونچا سمجھتا تھا۔ اور مجھ سے خائف تھا۔ مگر یہ یقین کہ مریم مجھے چاہتی ہے کافی تھا۔ مجھے کسی اور کے قبول کرنے اور کہنے کی ضرورت نہ تھی۔

پہلی راتوں کا چاند چھپ کر ستاروں کو زیادہ روشن چھوڑ گیا تھا۔ کہکشاں کا غبار، قطب تارا، سات تاروں کے جھرمٹ کی سیدھ میں۔ بکھرے ہوئے آنکھیں جھپکاتے روشن اور مدھم تیز اور بجھے بجھے سے قمقموں سے آسمان سجا ہوا تھا۔ وہ ساری رات میں نے آنکھوں میں کاٹ دی۔

عشق موت کی مانند زبردست ہے۔

روہی کی لڑکیاں بکتی ہیں۔

بستی کی لڑکیاں شادی کے بعد محبت کرتی ہیں۔

مریم ایک عام اور معمولی لڑکی نہ تھی۔ وہ حالات کے مقابلے میں ہتھیار ڈالنے والی

نہیں تھی۔ میں نے اپنے آپ کو بہت لوریاں دیں بہلایا کہ میں جب سے آیا ہوں تب ہی سے مریم مجھے چاہنے لگی تھی۔ بھلا یہ ہو سکتا تھا کہ مریم مجھے چاہنے نہ لگے۔ اپنے لئے میرے دل میں جتنی قدر و منزلت تھی وہ ساری مریم کو بہلانے اور اسے مجھ پر فدا کرنے کو کافی تھی۔ سوچنے، کروٹیں بدلنے اور روزنوں میں سے احاطے کے اس طرف دیکھتے جہاں مریم، شبّل اور امرایاخاں سوئے ہوئے تھے وقت گزر گیا یہاں تک کہ مرغ کی اذان نے رات کے ختم ہونے پر گواہی دی۔ صبح کا تارا ڈرتا کانپتا کہکشاں کے غبار میں سے نکلا۔

مشرق کی طرف سیاہی کسی اندرونی نور سے آسمان کی باقی سیاہی کے مقابلے میں واضح ہو رہی تھی۔ اور پھر بھی ظلمت ہی تھی۔ پھر بہت آہستہ سفیدی ان کناروں سے نمودار ہوئی، اور اندھیرے آسمان کا وہ ٹکڑا سفید ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ ٹیلے اور بھیٹ الگ الگ نظر آنے لگے۔ پھر وہ سفیدی کانپنے لگی اور کانپتی رہی جیسے پارہ بہنے کے لئے بے تاب ہو اور پھر بھی حدوں میں قید ہو پھر جیسے بھک سے لاوہ آتش فشاں کے راہ سے ہٹ جائے۔ وہ کانپتا ہوا پارہ دم کے دم میں قید ہو گیا۔ اور ایک ان دیکھا ان جانا اور پھر بھی صدیوں سے روشن گولا ایک نئے دن کے دامن پر طلوع ہو گیا۔ میں دروازے کے سامنے لیٹا تھا اور ابھی تک مجھ پر کیکپی طاری تھی میں نے آج سے پہلے کبھی صحرا میں سورج کو نکلتے نہیں دیکھا تھا۔ عظیم پُر عظمت اور انسان کو اپنی کم مائیگی بے چارگی کا احساس دلانے کے لئے میں نے اس صبح سے

بڑھ کر کسی شئے کو نہیں دیکھا۔ مشرق کی سُرخ دھاریاں مٹ گئیں۔ اور تیز چمکتا ہوا اور نگاہوں کو خیرہ کرنے والا صحرا کا دن شروع ہو گیا۔

چاٹیوں کی گھمکار بچوں کا شور مرغوں کی اذانیں اور عام دنوں کی طرح تھیں مگر بستی میں کسی کو کیا پتہ تھا کہ میں نے قدرت کے کارخانے کا ایک گوشہ دیکھا تھا اور اس بے نقاب گوشے کو دیکھنے کے بعد مجھ میں حوصلہ باقی نہیں رہا تھا۔ آخر انسان کیا ہے؟

دوپہر کے قریب نور خاں اور اس کی بیوی آگئے تھے۔ وہ دونوں چپ چاپ تھے۔ مریم اور سنبل جب بھیڑوں کو لے کر چلی گئیں تو امرایا خاں میرے پاس آیا۔

میں نے کہا استاد عیسیٰ کا کیا حال ہے۔

کہنے لگا "میرا خیال ہے وہ ٹھیک ہو جائے گا۔ جراح قابل آدمی ہے۔" اور یہ کہہ کر اس نے اپنی بہن کی طرح میری آنکھوں میں دیکھا۔

میں نے کہا "امرایا اگر تم اس رشتے سے خوش نہیں ہو تو میں کیا سمجھوں؟"

وہ کھڑا تھا بیٹھ گیا اور تخت کے کنارے سے الف لیلہ اٹھا کر ورق گردانی کرنے لگا۔ پھر ایک صفحے کو الٹ کر تھوڑی دیر پڑھتا رہا اور پھر بولا۔

"زندگی بھی ایک کہانی ہے سائیں۔ الجھی ہوئی اور سمجھ میں نہ آنے والی۔ اگر ہر بات کو سمجھنے کی کوشش کرو تو جینا دوبھر ہو جائے۔ ذہن اتنے سوال کرتا ہے جن کا جواب کہیں سے بھی نہیں ملتا۔ کوئی ان سوالوں کو سمجھنے میں وقت نہیں لگاتا اور زندگی گزر جاتی ہے۔ جب آپ یہاں آئے تھے تو گرمی اور تپش تھی۔ اب ٹوبہ پانی سے بھرا ہے

ٹیلوں پر گھاس ہے۔ بھبٹ آباد ہیں شکار وافر ہے۔ جھاڑیاں پھولوں سے لدی ہیں۔ دودھ برتنوں میں نہیں سماتا۔ جانور خوش ہیں ہر طرف نغمہ اور خوشی ہے۔ یہ تو ظاہر ہی ہے۔ پر چاند کی روشنی کسی کو ڈستی ہے اور کسی کو آسودگی دیتی ہے۔ سردی میں بہار ہوگی یہی اجاڑ علاقہ آباد ہوگا۔ بہار میں یہاں پر کیا کیا رنگ رنگ ہونگے۔ ہر سال یہی ہوتا ہے اور جب ہم نہ ہوں گے یہی ہوگا۔ جب ہم نہیں تھے تب بھی یہی تھا۔ دنیا کے نقشے پر انسان تو ایک ذرّہ ہے۔ جس کے اِدھر اُدھر ہو جانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ اپنی سمجھ پر نازاں ہوتا ہے۔ سوچتا ہے زمین و آسمان اور ہر شے اس کے فائدے اور خوشی کے لیئے ہی ہے۔ اصل میں کچھ بھی اس کے لئے نہیں ہوتا۔ آدمی حالات کے ہاتھ میں ایک ادنیٰ سا کھلونا ہے۔ قدرت بادشاہ کی طرح ہر رات نئے آدمی کو منظورِ نظر بناتی ہے اور پھر اسے ناکام نامراد پھیر دیتی ہے مگر اس کے پاس پیار کا دوزخ ہے جس میں وہ سڑا کرتا اور جلتا ہے اور اسی ایک رات کو واپس لانے کی جستجو کرتا ہے۔"

میں نے کہا امراؤ تمہارے دل میں یہ تلخی کیوں اور کس لئے ہے۔ تم جوان آدمی ہو مایوسی کا یہ طریقہ انسان کو ناکارہ بنا دیتا ہے۔ سوچو اور اپنی پریشانی پر قابو پانے کی کوشش کرو۔"

وہ اسی طرح الف لیلیٰ کی ورق گردانی ہوئے میری طرف دیکھے بنا بولا۔

"میں خواجہ سگ پرست ہوں۔ انسانوں سے نفرت کرنے والا۔ جب سے

عیسیٰ خاں زخمی ہوا ہے میں خدا کی طرف سے مایوس ہو گیا ہوں۔ آدمی اپنے کسی گناہ کے بدلے نہیں بس یونہی سزا بھگتا ہے۔ تکلیف اٹھاتا ہے اور کبھی دیئے کی لو کی طرح بھڑک کر بجھ جاتا ہے۔

میں نے کہا مجھے لے چلو میں عیسیٰ کو دیکھنے چلوں گا۔

امر آیا اٹھتے اور کتاب کو تقریباً تخت پر پٹختے ہوئے بولا، "کیا اُسے یہ دکھانے کی خواہش ہے کہ وہ نامراد آدمی ہے جس کی اپنی چھوٹی سے چھوٹی خواہش کبھی پوری نہ ہو سکی۔ سائیں اگر وہ زخمی نہ ہوتا تو میری بہن مریم آج اس کی بیوی ہوتی۔"

میں نے کہا، "امر آیا مجھے غلط نہ سمجھو اگر اب بھی عیسیٰ تندرست ہو جائے تو میں اپنے فیصلے کو بدلنے اور مریم سے دست بردار ہونے کو تیار ہوں۔ میں زندگی میں ناکام اور نامراد رہنا پسند کروں گا۔ بہ نسبت اس کے کہ میری وجہ سے تمہیں یا عیسیٰ خاں کو کوئی تکلیف ہو۔"

امر آیا مجھ سے آگے چل رہا تھا۔ اور راہ دکھاتا جاتا تھا۔ میں اور پیرن پیچھے تھے۔ اُسے شاید دوست کے پاس پہنچنے کی جلدی تھی کہ وہ کوئی بات نہیں کر رہا تھا۔ خیالوں میں ڈوبا اونٹنی کی مہاریں ڈھیلی چھوڑے تھا۔ اونٹنی راہوں سے آشنا آپ ہی آپ ٹیلوں پر چڑھتی اترتی خوبصورت بجرے کی طرح جا رہی تھی۔ آتے ہوئے میں نے مریم کے چہرے کو دیکھنے کی تمنا کی تھی۔ مگر وہ ٹوبے پر سہیلیوں کے ساتھ پانی

بھرنے گئی ہوئی تھی۔ میں نے گلی کے نکڑ تک جا کر دیکھا تھا پر وہ نظر ہی نہیں آئی
سوار ہو کر ہم آگے بڑھے ہیں تو موڑ مڑتے ہی ننھیال بستی اوجھل ہو گئی۔

جھاڑیاں پھولوں سے بھری ہوئی تھیں۔ بھیڑیں گھاس میں منہ چھپائے سر ہلاتی اور اپنے گلے میں پڑے گھنگروؤں کی ٹنٹناہٹ سے آپ ہی خوش تھیں۔ کھیت کے پھیلے ہوئے پودے، ہوا میں ہلتے کر ڑ گنڈے جیسے ریشمی پور رہوں، سبز، اودے، لال پیلے پھولوں سے جھاڑیاں جھکی پڑتی تھیں۔ لڑکیاں اور عورتیں ٹوکریاں اپنے پیچھے باندھے پیلو چُن رہی تھیں اور ساتھ ہی ساتھ کھاتی بھی جاتی تھیں۔ جال کے اکیلے درخت کے نیچے نیچے اور پانی کی ٹھیلیاں پڑی تھیں۔ مور بول رہے تھے اور چرواہے بانسری بجاتے بھیڑوں کے گلوں اور بکریوں کے ریوڑوں کے آس پاس کہیں اوٹ میں آرام کر رہے تھے۔ ہرنوں کی ڈاریں کبھی سامنے سے بھاگتی ہوئی نکل جاتیں۔ ایک ہرنی کا بچہ بھاگتے میں گر گیا اور وہ اپنی جان کی پرواہ کئے بنا بھاگتے ہوئے رک گئی۔ بچہ بھاگنے لگا۔ اس کی ننھی سی سُرخ دُم ہوا میں اٹھی ہوئی تھی۔ جگہ جگہ جہاں نشیب میں پانی جمع ہو گیا تھا خانہ بدوش قبیلے ڈیرہ ڈالے پڑے تھے۔ ان کی لڑکیاں جھانجھریں بجاتی چاندی کے زیوروں سے لدی بھیڑوں کو ہنکاتی پھر رہی تھیں۔ بستیوں اور گاؤں سے باہر یہ قافلے سے تھے کہ پانی کی تلاش میں پھرتے پانی پہ ٹھہرتے اور پانی ختم ہونے پر دوسری جگہ چلے جاتے۔ جگہ جگہ ٹیلوں پر جھوکیں آباد تھیں۔

چراغ جلے ہم رکھنی پہنچے۔
عیسیٰ خاں خاموشی سے مجھے دیکھتا رہا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش نہیں کی۔
میں نے کہا "عیسیٰ خاں میں اتنی دُور سے تمہیں دیکھنے اور یہ کہنے آیا ہوں کہ تم تندرست ہو جاؤ۔"

امرآیا نے اس کے پاس بیٹھ کر بہت محبت سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا "جراح نے علاج شروع کر دیا ہے نا اب تم چند دنوں میں ٹھیک ہو جاؤ گے۔" اس نے بھی کہا "میں بھی یہی سوچتا ہوں تندرست ہو جاؤں تو اتنے بہت سے شکار میں سے اپنا حصّہ تو وصول کر لوں۔"

دونوں ہنسنے لگے۔

مگر عیسیٰ خاں کے چہرے پر موت کی زردی کھنڈی تھی اس کی آنکھوں میں جینے کی آس کم تھی۔ وہ صرف اُمرآیا کو تسلّی دینے کی خاطر ہنسا تھا اور شکار کا ذکر کر رہا تھا۔

گاری خاں بھی باہر سے آ کر ہماری گفتگو میں شامل ہو گیا۔ وہ تین چار دنوں سے یہیں پر تھا۔ عمر خاں، بلند خاں کا چھوٹا بیٹا باہر بیٹھا ہماری پروہ کیے بنا زور زور سے گا رہا تھا۔ مگر میں نے اسے معاف کر دیا۔

گاری خاں اپنے فوج میں گزارے دنوں کا ذکر کرنے لگا۔ جراح نے عیسےٰ کو سلانے کے لئے کوئی خواب آور دوا دی تھی۔ اور جب اُمرآیا نے اُسے

دوا پلادی تو ہم سب باہر آ گئے۔ بستی کے گھروں میں جلتے دیوں کو دیکھنے لگے۔ رات ناقابلِ یقین حد تک خوبصورت اور مکمل لگ رہی تھی۔ اُمرآیا نے کہا "گاری خاں اتنے برسوں سے تم ننھیال میں رہتے آئے ہو میں نے تم سے کبھی یہ نہیں پوچھا کہ تم جو فوج کی زندگی کا اتنا ذکر کرتے ہو آخر فوج چھوڑ کر کیوں چلے آئے۔ ابھی تم اتنے بوڑھے بھی نہیں ہو اور پھر ملک کو تمہاری ضرورت بھی تھی۔ بتاؤ تو سہی۔

میں نے کہا "ہاں گاری خاں تم اتنے تندرست شکاری ہو کہ دوڑتے ہرن پر نشانہ باندھو تو کبھی نہیں چوکتا پھر تم نے فوج کیوں چھوڑ دی۔"

بیرن نے کہا "سائیں کبھی کبھار آدمی کو اپنی جان بہت پیاری لگنے لگتی ہے اور وہ اُسے جوکھم میں نہیں ڈالنا چاہتا۔"

گاری خاں نے اس کی طرف دیکھا اور پھر زور سے "کیوں" کہا۔

اُمرآیا نے کہا "نہیں یہ بات نہیں ہو سکتی بیرن۔ کیوں گاری خاں یہ بات نہیں ہو سکتی نا؟"

بوڑھے شکاری نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھا کر کہا "بیرن اور اُمرآیا تم دونوں بچے ہو۔ اور میں بھی بچا ہوں۔"

وہ خاموش تھا۔ پھر اٹھا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا گوپے کے اندر گیا۔ جہاں عیسیٰ خاں سو رہا تھا۔

ہم تینوں گزرتی رات کی چاندنی میں جو بڑی بھیگی اور کیف آفریں تھی ایک

دوسرے سے کوئی بات کئے بنا بیٹھے رہے، ہمیں گاری خاں کا انتظار تک نہ تھا۔ یہ ایسی رات تھی جس میں محبتیں بکواس لگنے لگتی ہیں۔ نفرتیں اس سے بھی لایعنی لگتی ہیں۔ جنگیں اور حقوق کی حفاظتیں سب بے معنی باتیں معلوم پڑتی ہیں۔ صرف انسانی جان قیمتی لگتی ہے۔ انسانی جان اور انسان کا خون۔ سرحدوں کے جھگڑے نہ کھنی اور رہنماؤں اور رکن پور اور موہوم لکیریں سب خواب میں سنے قصے کہ آنکھ کھول کر دیکھو تو کسی شے میں وہ دلآویزی اور سحر نہیں جو آدمی کے حواس گم کرتا اور اسے لڑنے پر مجبور کرتا ہے۔

بہت دیر کے بعد جیسے صدیاں کہہ لو ہم نے گاری خاں کو بیمار آدمی کی طرح گرتے پڑتے اپنی طرف آتے دیکھا۔ وہ اپنی جھونپڑے میں رکھی شراب پی کر آیا تھا۔ اس کے سر پر پگڑی نہ تھی اور سفید بال چاندی کا جال سا معلوم ہوتے تھے۔ اس نے اپنی گھنی بھنویں اٹھائیں اور بہت غور سے ہماری طرف دیکھ کر کہا "کیوں اُمرایا خاں کیا تم ضرور پوچھو گے کہ میں نے فوج کیوں چھوڑ دی ہے؟"

اُمرایا نے کوئی جواب نہ دیا۔

بیٹے یہ ان دنوں کی بات ہے جب تم شاید ابھی پیدا بھی نہیں ہوئے ہو گے۔ میں سرحد پار کے ایک گاؤں میں سے کھیتی باڑی چھوڑ کر دوسری جنگ میں بھرتی ہو کر وطن سے دور چلا گیا۔ میرا گاؤں دنیا کے کسی حصّے میں اس سے زیادہ خوبصورت گاؤں تم نہیں دیکھو گے۔ درختوں کے گھنے جھنڈوں اور کھیتوں کے سبزے سے گھرا۔

یہ دریا کے کنارے کا ایسا ٹکڑا تھا جسے دیکھ کر تم کھو گئے کہ جنت زمین پر اتر آئی ہے۔ لالیاں جنت ہی تھی۔ میرا چھوٹا سا گھر۔ میرے اناج کی بالیوں سے اُبلتے کھیت۔ میری بچی جو محبت سے جب گلے میں باہیں ڈالتی تو مجھے جینے اور زندگی کا مطلب سمجھ میں آنے لگتا۔ میرا بیٹا جو اگر زندہ ہوتا تو تمہاری طرح جوان ہوتا۔

ہم دونوں بنا رُکے مارچ کرتے رہتے۔ جنگ میں جانے والے سپاہی کے دل میں کتنے ولولے ہوتے ہیں کتنے سہانے خواب ہوتے ہیں۔ یہ میدان میں جاکر یہ سارے خواب پرانے چیتھڑوں کی طرح گر پڑتے ہیں اور انسانی روح ننگے بدن اپنے گردو پیش دیکھتی ہے۔

دشمن کے جہاز سروں پر اتنے نیچے جھک آتے کہ لگتا ہمارے سر اڑ جائیں گے۔ چلتے ہوئے ابھی تم کسی سے بات کر رہے ہو۔ بات ختم نہیں کر چکے کہ دشمن کے جہازوں نے آلیا ہے۔ چھپتے ہو تو گولے قریب آکر پھٹتے ہیں۔ جب غبار صاف ہوتا ہے تو تم اپنی آدھی بات سنانے کے لئے اپنے اس ساتھی کو تلاش کرتے ہو مگر تمہارا ساتھی اوندھے منہ لیٹا ہے اس کی پشت اڑ چکی ہے۔ اور اب بتاؤ تم کیا کر سکتے ہو۔

راشن ختم ہو جاتا مگر بھوکے اور پیاسے جان بچانے کے لئے آگے ہی آگے بڑھنا ہوتا تھا۔ گاؤں کے گاؤں خالی ہوتے۔ محبت کے بول، آرام اور سکون کے لئے جی ترس جاتا مگر رکنا موت تھی۔ بوٹوں میں پڑے پڑے پاؤں

جھگڑے کا حصہ بن چکے تھے۔ ایک بار مہینوں ہمیں اپنی حفاظت کی خاطر مسلسل رات دن کام کرنا پڑا تھا۔ ایک اجاڑ گاؤں میں ہم چند ساتھی رک گئے۔ خوفناک خاموشی میں چاروں طرف ویرانی اور جلے ہوئے مکانوں کے ڈھیر تھے۔ میں اور میرا ایک دوست کھانے کی تلاش میں گھومتے ہوئے ایک کھنڈر میں پہنچے۔ ایک بڑھیا جو آنکھوں سے اندھی تھی راکھ کرید رہی تھی۔ جب ہمارے بوٹوں کی آہٹ سنی تو کہنے لگی "خدانے قیامت کا دن گزار بھی دیا مگر بچھڑے ہوئے نہیں ملے" میرا جی اتنا بیزار ہوا کہ میں نے کھانے کے لئے کسی شے کی تلاش چھوڑ دی اور واپس آگیا۔ جنگ ایسے ہی مذاق کرتی ہے۔ کون جیتا اور کون ہارا یہ تو خدا جانتا ہے۔ مگر انسانوں کے ساتھ یہی ہوتا ہے۔ جب جنگ جیت لی گئی تو ہندوستان کی آزادی کا وعدہ پورا کرنے کا وقت آیا۔ ان دنوں میں نے فوج سے نام کٹا لیا تھا۔ اور اپنے بال بچوں کے ساتھ لائلپور میں رہتا تھا۔ میرا ایک چھوٹا سا خوبصورت گھر تھا۔ میرے کھیت تھے۔ درختوں میں کوئلیں کوہو کوہو بولتیں۔ آم کے لدے ہوئے پھل کے بوجھ سے جھکے جاتے تھے۔ ہر شے اتنی مکمل اور خوبصورت تھی۔ مجھے جنگ کے سالوں میں سہے ہوئے غم بھول رہے تھے۔ میری بچی جوان ہو رہی تھی۔ اس کے چہرے پر سرخی نئی پھوٹتی کونپلوں کی طرح تھی اسے دیکھ کر مجھے سب مصیبتیں بھول جاتیں۔ میں اس کی شادی کی تیاریاں کر رہا تھا۔ مجھے ہو اگر وقت مجھے مہلت دیتا تو وہ بیاہی جا چکی ہوتی۔ اس کے ہاتھوں میں مہندی لگتی۔ میرے گھر کے آنگن

میں نیم تلے سہاگ کے گیت گائے جاتے اور دالانوں میں بڑے سرخ پایوں پلنگ پر میرا جوان داماد شرمیلا سا لڑکا آن کر بیٹھا کرتا۔ میرے گھر میں جھانجھریں بجاتے مہندی رنگے پاؤں سے گھومتی۔ اور چھوڑے سے بھرے سفید کلائیوں اور چھلوں سے بھری انگلیوں والے ہاتھوں سے چھاچھ بلوتی۔ دودھ کی چاٹی کی گھمکار سے میری گلی بھی گونجتی۔ اور میری بیوی پوتوں کو کھلاتی ہوئی پرانے دنوں کی سنی لوریاں دہرایا کرتی۔ مگر وہی ہوا جو خدا کو بھی منظور نہیں ہو سکتا تھا۔

میں نے اس جنگ میں بیگانوں کو مرتے دیکھا تھا۔ اس جنگ میں اپنوں کو کٹتے دیکھا تھا اور پھر بھی زندہ ہوں۔ امرآیا خاں میں زندہ ہوں۔ پیر جی میں زندہ ہوں اور مر نہیں سکتا۔ تم لوگ مجھے دیوانہ کہتے ہو نا۔ مگر رام دیا کبھی عیسیٰ خاں کی ٹانگ زخمی نہ کرتا۔ اگر یہ موہوم حدیں اور فاصلے نہ ہوتے۔ تو لو کیا اب بھی میں فوج میں بھرتی ہو جاؤں۔ اور اپنے جگر کے ٹکڑوں کو کاٹوں۔ اپنے ہی گھر کی چار دیواری میں گولیاں چلاتا دائیں بائیں تباہی مچاتا پھروں۔ تو لو نا۔

امرآیا خاں نے کہا "تم ٹھیک بھی کہتے ہو اور غلط بھی۔ اصل میں کوئی شے تباہ نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ روح کبھی نہیں مرتی۔

گاری خاں نے کہا "میں کسان آدمی ہوں۔ روح اور جسم کے رشتے کو نہیں سمجھتا۔ کتابوں میں کیا لکھا ہے میں نے نہیں پڑھا۔ مگر اتنا جانتا ہوں کہ جب جسم تباہ ہوتا ہے تو بہت تکلیف ہوتی ہے۔ بچپن میں مسجد کے ملّا کہا کرتے تھے

کہ تمہارے کئے کا پھل دس حصے دنیا میں ملتا ہے اور ستر حصے آخرت میں۔ مرنے کے بعد جو ہوگا اسے کون جانتا ہے۔ مگر زندگی میں جو تباہی ہوئی کیا وہ کرموں کا پھل تھا؟

میں دل ہی دل میں گیتا گووندا کے وہ ٹکڑے دہرا رہا تھا جس میں ارجن اور کرشن بھارت کے لئے دشمن کی فوجوں کے سامنے اپنے یقین اور بے یقینی کو دہراتے ہوئے اپنے آپ کو سچ ثابت کرتے ہوئے بحث کرتے ہیں۔ "جسم تو بھسم ہو جانے والی شئے ہے وہ جسم کی اساس ہے اُسے دوام ہے اس کی کوئی حد ہی نہیں وہ کبھی فنا نہیں ہو سکتی۔ سُو ارجن تم لڑتے رہو۔"

بھگوان کرشن نے ارجن سے کہا، "ہے ارجن تو سب کرموں کا تیاگ کرکے ایک میرے شرن آ۔ تجھ کو پاپوں سے مکت کر دونگا۔"

ارجن نے پوچھا، "تمہاری شرن پڑنا کوئی دھرم ہے؟"

اور بھگوان نے کہا، "یہ پرم دھرم ہے اوتم دھرم ہے۔"

من پرم چنچل ہے اور مست ہاتھی کی بنائیں بلوان ہے اس کا پکڑنا تو پون سے بھی کٹھن ہے۔

بھگوان نے کہا، "مہابا ہو ارجن اس میں سندیہہ کچھ نہیں۔ من ایسا ہی چنچل ہے۔ اور پکڑا بھی نہیں جاتا۔ پر اس کے پکڑنے کے دو اُپاؤ ہیں، میرے ساتھ پریت اور سنسار کے وگیان سے براگ۔"

گاری خاں نے ستار کے وگیان سے بیراگ نہیں لیا تھا۔ وہ ایک سپاہی کی طرح لمحوں میں زندہ تھا۔ اس کے پاس سوائے ماضی کے کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ ایک سپاہی کی طرح اپنا آپ ثابت کرتے اپنے اندر کے کھرے اور کھوٹے کو پرکھنے نکلا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ کیا پرکھ رہا تھا اور میں جانتا ہوں کہ میں اپنے اندر چھپے خوف پر غالب ہونے کے لئے یہ سب کچھ کرنا چاہتا ہوں۔ اپنی قوتِ مدافعت آزمانا چاہتا ہوں اور میرے اندر کوئی شے تھی۔ جو ان سارے سیدھے سادے لوگوں کے سامنے مُکر جاتی اور حیرت انگیز طور پر مجھ پر یہ بات ظاہر ہوتی کہ میں کسی کھوٹے اور کھرے کو پرکھنے اور ثابت کرنے کی قوت نہیں رکھتا۔

عُمرایا خان عیسے خاں کو دیکھنے کے لئے اندر چلا گیا تو گاری خاں نے کہا عمر خان ابھی ان ٹیلوں کی طرف گیا ہے۔ وہ بہت ہوشیار لڑکا ہے۔ اس کی دوستی بھی جیسلمیر کے لوگوں سے ہے مگر سوائے ملنے ملانے اور کبھی کبھی تحفے دینے کے اس نے کسی شے کی خواہش نہیں کی۔

تمہیں ساری دنیا کی خبریں کس طرح پتہ چل جاتی ہیں۔ کون کسی سے کیا لیتا ہے کس کی کس سے کتنی دوستی ہے۔ تمہیں ہر بات کی خبر رہتی ہے۔

گاری خاں ہنسا اور کہنے لگا۔ "میں ٹیلوں پر آوارہ گھومتا رہتا ہوں۔ شکاری آدمی ہوں اور جب میرا شکار بھاگ کر اُدھر چلا جائے (اس نے سرحد

سے پرلی طرف اشارہ کیا) تو میں اسے ادھر سے آپ ہنکالاتا ہوں۔"

پیرن کمبل بچھا کر سونے کی تیاری کر رہا تھا کہ ہم نے ٹیلوں کے پار سے ٹھائیں ٹھائیں کی آواز سنی ۔ میں لیٹا ہوا تھا اٹھ کر بیٹھ گیا۔ گاری خاں نے کہا "وہ ایک نہیں کئی ہیں اور عمر خاں اکیلا ہے۔" پھر وہ پیچھے مڑے بنا گوپلے سے بندوق نکال کر بھاگتا ہوا سیدھا آواز کی طرف چلا گیا۔ اُمرایا میں اور پیرن بھی بندوقیں اٹھائے ریت کے ٹیلوں پر سے آواز کی سیدھ معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بھاگنے لگے۔

چاندنی میں جو بادلوں کی سفیدی کی وجہ سے بہت واضح نہیں تھی ہمیں سامنے والوں کی صحیح پوزیشن کا پتہ نہیں چل سکتا تھا۔ ٹیلے پہاڑیوں کی طرح اونچے تھے عمر خاں کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ البتہ گاری خاں بہت پھرتی سے گولی چلا کر ایک سے دوسرے ٹیلے کی طرف تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ جھاڑیوں کی اوٹ لیتا وہ ایک چھلاوے کی طرح کبھی نظروں کے سامنے سے غائب ہو جاتا اور کبھی ہم اُسے دیکھ لیتے۔

رکھنی کے قریب کسی زمانے میں یہاں سے گزرنے والے دریائے گھاگھرہ کی گزرگاہ تھی جو اب خشک تھی اور چھوٹی چھوٹی جھاڑیوں اور ٹوبوں سے پٹی پڑی تھی۔ یہ خشک دریا قدرتی حد تھی جو بستی سے تقریباً ایک میل کے فاصلے پر ہو گی۔ میرے پاؤں ریت میں دھنستے جاتے اور جوتا پاؤں سے نکل نکل پڑتا تھا۔

بستی کے ٹوبے کی دوسری ڈھلوان کی طرف جو سرحد کے ساتھ تھی اور جھاڑیوں گھاس اور جھنڈ کے درختوں کی وجہ سے نظر نہ آتی تھی۔ ہم نے چاندنی میں دو تین سائے ابھرتے دیکھے اور بیشتر اس کے کہ ہمارا نشانہ ٹھیک بیٹھتا وہ سائے غائب ہو گئے۔ جانے وہ کتنے ہوں گے کہ ہولے ہولے بستی کی طرف بڑھ رہے تھے۔

ہم نے تین طرف سے ٹوبے کو اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا اور چوتھی طرف وہ خود تھے۔ ان کے پاس بستی میں گھسنے کا راہ سوائے ٹوبے میں سے ہو کر آنے کے دوسرا نہ تھا۔ اونچے ٹیلوں پر بھی رکھنی پوسٹ سے آئے ہوئے جوان چڑھے بیٹھے تھے۔ وہ ہر طرف سے ہمارے نرغے میں تھے۔ پھر میں نے دو لکڑیوں کو دیکھا جو تیرتی ہوئی ہمارے کنارے کی طرف بڑھ رہی تھیں ہوا تیزی اور تندہی سے چل رہی تھی تو میں سوچتا شاید یہ لکڑیاں بکھرے ہوئے ٹوبے کی تہہ میں سے نکل آئی ہیں اور حالیہ بارشوں کے بعد پانی پر تیر رہی ہیں۔ مگر ہوا بھی گم صم حیران یہ سارا منظر دیکھ رہی تھی اور چاندنی بھی بادلوں کی اوٹ میں تھی۔ بادل ٹھہرے ہوئے تھے اور زرد سی روشنی جھاڑیوں اور کنجوں کے سائے میں سنسناتی لگتی تھی۔

عمر خان نے بھی میری طرح یہ منظر دیکھا ہو گا۔ وہ کہیں میرے قریب ہی چھپا ہوا تھا کہ اس نے ٹھہرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی اور بیشتر اس کے

کہ میں اُسے پکارتا اور رکنے کو کہتا وہ ٹوبے میں کود گیا اور کنارے کے پاس اُگے ہوئے سرکنڈوں میں غڑاپ کی آواز آئی۔

وہ اپنی بندوق سر سے بلند کئے تیزی سے دشمن کی طرف جا رہا تھا۔ اب ایک لمحہ ضائع کرنے کا وقت نہ تھا۔ اگر میں عمر کے نخنے تک پہنچنے سے پہلے گولی چلا دوں تو شاید عمر بچ سکے۔ مگر دُور سے نشانہ باندھنا ذرا مشکل تھا۔ میں نے نشست باندھی اور اللہ کا نام لے کر گولی چلا دی۔ عمر کا پانی سے اوپر اُٹھا ہوا ہاتھ ایک دم گر گیا

اوہ میرے خدا۔ اوہ میرے خدا۔

تم بزدل ہو بزدل۔ کسی نے میرے اندر کہا۔ میں جہاں کھڑا تھا وہیں بیٹھ گیا اور دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ لیا۔

پاروالے اپنے دو زخمی ساتھی اور سامان کا ایک اونٹ چھوڑ گئے تھے۔ عمر خان کے سیدھے ہاتھ کی ہڈی سلامت تھی۔ گولی کھال کو چھوتی ہوئی گزری تھی۔ سبع بلند خان اپنے بیٹے کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا اور بستی کے سہمے ہوئے بچے اور جوان فرد اس گھر کے سامنے اکٹھا ہو رہے تھے۔

بیرن نے جب زخمی دشمنوں کو پانی پلانا چاہا تو انھوں نے آنکھیں کھولے بنا سر کو ہلا کر انکار کر دیا۔ میں نے زندگی میں پہلی بار دشمن کو اپنے سامنے اور اپنے قبضے میں دیکھا تھا مگر وہ قبضے میں ہونے کے باوجود آزاد تھے۔ اور میں نے آج تک دشمن دیکھے ہی کہاں تھے۔ انکار کے بانکپن کو نفی کے ناز اور استغنا کے حُسن کو اس دن پہلی بار

میں نے دُور دور دُور دیکھا۔

جب ہم رہاں واپس جا رہے تھے تو بلند خاں نے مجھے ہرن کے خشک گوشت اور سوکھے دودھ کے دو تھیلے دئے کہنے لگا یہ اجاڑ دیس ہے جہاں میلوں پانی نہیں ملتا ہم غریب روہیلے ہیں۔ جانوروں کے گلے کو لیکر ایک جگہ سے دوسری جگہ گھومتے ہیں گھاس کے گھروں میں رہتے ہیں جب آسمان دھوپ کے رنگ کا سفید ہو جاتا ہے اور زمین تنور کی طرح تپ جاتی ہے تو ہم لوگوں کو سر چھپانے کا ٹھکانہ بھی نہیں ملتا۔ ہم تو آپ کی کوئی خدمت نہ کر سکے۔ یہاں کی سوغات تو دھوپ اور گرمی ہے۔

میں نے بلند خاں کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اپنے آپکو ایک ایسے بچے کی طرح جانا جو بڑوں میں ہو اور بڑوں کی طرح حرکتیں کرے۔ خود من ہی من میں اپنے پر ہنستا ہیرن کے ساتھ واپس آگیا۔

مریم کے آنگن میں سہاگ کے لمبی تانوں والے راگوں کا میلہ ایک بار پھر لگا۔ ایک مہینہ پہلے سے رات گئے تک عورتیں اور لڑکیاں گاتی اور ناچتی رہتیں۔ جب شام ڈھل جاتی اور کام سے فارغ ہو جاتیں تو سبتل اور مریم کی ماں ڈھولک لیکر اپنے احاطے میں بیٹھ جاتیں۔ پھر گلی کی عورتیں بچوں سمیت آکر ناچنے والوں میں شامل ہو جاتیں رات تک یہ میلہ لگا رہتا۔ میں ٹیلوں پہ گاری خاں کے ساتھ گھومتا۔ جانے کیوں اُن

دتوں میرا دل جذبات کی رو میں بہہ کر جیسے خاں سے چھینی ہوئی یہ خوشی محسوس نہ کر سکتا مگر میں اب نور خاں سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا اور پھر یہاں کا دستور تھا اگر میں نہیں کوئی اور ہوتا تو تب بھی یہی کچھ ہوتا۔ کبھی ٹیلوں کے پیچھے کی وہ ساعت یاد آتی جو میرے وجود کی گرمی اور دل کی زندگی تھی۔

چاولوں کو صاف کرتے اور بیاہ کے سلسلے میں چھوٹے موٹے کام کرتے بستی کی لڑکیاں ایک نیا راگ شروع کر دیتیں۔ مگر ان گیتوں میں جیسے خوشی کا وہ بول نہیں تھا جو آواز کے سوز کو ساز اور عورت کی بدصورتی کو حسن بخشتا ہے۔

مریم اسی طرح بھیڑوں کے گلے چرانے جاتی اور گھر کے کام کرتی۔ اگر کہیں کبھی گلی میں اس کا میرا آمنا سامنا ہو جاتا تو وہ شرمائے اور پلک جھپکائے بنا میرے پاس سے یوں گزر جاتی جیسے کبھی کی جان پہچان ہی نہ ہو۔ یہ بے رخی مجھے باوجود کہ میں شگونوں میں یقین نہیں رکھتا تھا بدشگونی لگتی۔ جوان لڑکیاں تو بیاہ کے نام سے شرما جاتی ہیں۔ سنا ہے کہ کنواری لڑکیوں کی آنکھوں میں خواب تیرنے لگتے ہیں۔ مگر مریم شاید ان سب سے مختلف تھی۔ میں وقت کے گزرنے کا منتظر تھا۔

آٹھ دن پہلے اونٹوں کے مہمانوں سے بھرے کجاوے نور خاں کے احاطے سے باہر بھوری ریت کے ٹیلوں اور سبز جھاڑیوں کے دامن میں آن کر اترنے لگے۔ نئے جوڑوں سے بھری تھیلیاں گوپے کی چھت کے ساتھ لٹکنے لگی تھیں اور ہر آنے والے کے ساتھ ان میں اضافہ ہو جاتا تھا۔ جھونپڑوں کی نئی قطاریں، بوٹیوں کے ڈھیروں کے فرش پر ابھرتی

جاتی تھیں۔ جیسے ایک نیا شہر آباد ہو رہا ہو۔ رات کو جوان نقارے بجاتے اور عورتیں گیت گاتیں۔ پانی کی فراوانی تھی۔ دودھ دہی کی نہریں بہہ رہی تھیں۔ سردار کی لڑکی امیرزادے سے بیاہی جانے والی تھی۔

عورتوں نے مانگ بھر کر دھڑی گوندھی تھی۔ سرخی سہاگ سے ہونٹوں کو سجایا تھا کجلے کی سیاہی آنکھوں میں دلآویزی سے کونوں تک پھیلی ہوتی۔ بالیوں سے بھرے کانوں میں پھول ہوتے۔ زیوروں سے بھرے گلے میں سے کرتے کے شیشے آنکھ مارتے اور موتیوں کی چمک سے دیکھنے والوں کی نگاہوں میں چکاچوند ہونے لگی۔ اونٹوں کے ٹخنوں پر بندھی جھانجروں کی چھن چھن عورتوں کے پاؤں کی جھنکار کی طرح کانوں میں رس گھولتی۔ مرد ریشمی قمیص اور لنگیوں میں اکڑتے ہوئے چلتے۔ نرم نگاہوں والے لمبے تڑنگے ردھیلے اپنے چاندی کے بٹنوں کی نمائش کرتے اور زنجیر میں لٹکتے گھنگرو عورتوں کی ناک میں پہننے والی کیل کی طرح دور سے چمکتے۔ بازو بند باندھے وہ گلیوں میں گھومتے باؤلی کے فرش پر پڑ کر سوئے رہتے۔

رت جگے کی یہ راتیں خواب کی طرح مجھے آج بھی یاد آتی ہیں تو لگتا ہے وہ دنیا کوئی اور تھی جس میں کسی طلسم کے زور سے جا ابھرا تھا۔ یہ طلسم ہوشربا کی سی راتیں کہ بھریوں کے جھرمٹ ہوتے روشنی ہوتی رنگ و نور ہوتا۔ میں ایک کونے میں مکھی کی طرح لگا تھا کہ اگر اس پری وش کا جی چاہے گا تو اس سارے طوفان کے بعد مجھے اتار کر پھر آدمی کی صورت بنا دے گی۔

پیرن اور گاریی خاں دلہن کے گھر بھیجا جانے والا سامان خرید کر لاتے تھے۔ اور اپنی علیحدہ دنیا بسائے مجھ سے دور دور جانے کیا اصلاح مشورے کرتے تھے۔

سامنے والے گوپے کے سرے پر روز رنگین دھاگوں اور دھنک کے رنگوں کے کپڑے سے سہرے اور شیشے لٹکائے جاتے تھے۔ بھاگ سہاگ کے شگون کے لیے آنے والی مہمان عورتیں بھی تحفہ میں پراتی اور دلفریب رنگوں میں رنگی دھاگوں سے انگل انگل رلی دلائیاں دنیں۔ پھندنے اور شیشے جڑے موتیوں سے چمکتے ہوئے یہ بچھونے مہمانوں کو بوئی پر بچھا کر دیے جاتے۔ میں دم سادھے اکیلا ہی ٹیلوں سے پرے گھومتا رہتا۔ کبھی سنبل کا سامنا ہو جاتا تو کہتی۔

"سائیں مریم بری لڑکی نہیں ہے۔ بیاہ کے بعد آپ کی زندگی کو جنت بنا دے گی۔ آپ اداس کیوں رہتے ہیں۔"

بیلوں میں کچریاں۔ ریچھ۔ ککھڑیاں لگنے لگی تھیں اور صحرا میں پھولوں کی آگ تھی۔ پھول جو سرخ رنگ کے ہوتے اور سر شام چہچہانے والے سگڑوں کی آوازوں سے آباد ہوتے۔ پھول جن میں شہزادیاں قید نہ تھیں اور بیلو کے ساتوں رنگوں سے بچوں کے منہ رنگین رہتے۔ میری آنکھوں کے سامنے ناٹک ہو رہا تھا۔ اتنے سارے کھیل کھیلنے والے تھے صرف میں ہی اکیلا تماشائی تھا۔ ایک سادھو کی سی آسودگی اور بے تعلقی سے میں یہ سب دیکھتا۔ جانے اس کا انجام کیا ہو۔

ایک صبح جب میں طلوع ہوتے سورج کے روز حیرت زدہ کرنے

والے منظر کو دیکھتا ریشمی ریت کے لبستی سے دور کے ایک ٹیلے پر لیٹا تھا اور سیال پارہ تھرتھر کانپتا آتش فشاں کے سامنے سے ہٹنے ہی والا تھا تو میں نے شبل اور مریم کو دیکھا انھیں میرے وہاں ہونے کی خبر نہ تھی۔ وہ دونوں باتیں کرتی ہوئی میرے قریب سے گزر گئیں۔ باتیں جن میں عیسٰی کی بیماری کا ذکر تھا مریم چپ تھی صرف شبل بول رہی تھی۔

اگلا دن نکاح کا دن تھا۔ میں مریم سے ملنا چاہتا تھا۔ سارا دن میں اُسے دیکھتا رہا وہ کاموں میں مگن تھی۔ جیسے یہ بیاہ کسی اور کا ہو۔ جھٹ پٹے کے وقت جب چراغ جل رہے تھے اور نور خاں بیوی کے ساتھ بیٹھا ہر مہمان کو گن گن کر روٹیاں اور حلوہ تقسیم کر رہا تھا۔ میں ٹوبے کی طرف گیا۔ کندیری کی جھاڑیوں میں ٹوبے کے کنارے تک جھکی ہوئی ٹھنیں ڈیلوں لگنے لگے تھے وقت کیسے گزرتا۔

جب میں آیا تھا تو ہر طرف بے آباد بستیاں بے نور آنکھیں اور مرجھائے ہوئے چہرے تھے اور اب ہر طرف ہریالی پھول اور بہار تھی۔ یہ کنڈیری جو میرے خیال میں سوکھ چکی تھی پھلوں سے سہاگن کی طرح سجی کھڑی تھی۔

شبل اور مریم جب گھڑے بھر چکیں اور بڑے سے راہ کو لکڑی کے ڈنڈے سے بند کر چکیں تو میں نے آگے بڑھ کر کہا شبل مجھے مریم سے کچھ پوچھنا ہے۔

شبل ہنس کر کہنے لگی، "سائیں بس کل کی بات بیچ میں ہے"

میں نے کہا شبل یہ ہنسنے کی بات نہیں یہ بہت ضروری بات ہے۔ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ مریم نے شبل سے کہا "تم جاؤ اور راہ کی جھاڑیوں کے

ساتھ میرا انتظار کرو۔"

ہم دونوں وہ آگے اور میں پیچھے اس ٹوبے کے دروازے سے ذرا ہٹ کر جھاڑیوں کی طرف چلنے لگے۔ اس کے ننگے پاؤں کے قدموں کی چاپ میں سن رہا تھا اندھیرے کنجوں میں کرتی لالیوں کے شور میں یہ آواز زیادہ واضح نہ ہوتی تھی۔ وہ جھنجلا کر ٹھہر گئی۔ میں بھی کھڑا ہو گیا۔ وہ ایک جھاڑی کی بلند ہوتی شاخ پہ ہاتھ ڈالے ٹیلے کے ڈھلوان پر ایسے ٹکی کھڑی تھی کہ لگتا تھا اگر ہوا کا ہلکا سا جھونکا بھی آئے گا تو وہ گر جائے گی۔ اتنی خوبصورت اور ہلکی لگ رہی تھی جیسے کوئی پیڑ یا ہو۔ اس کی سیاہ آنکھوں میں گہرے ٹوبے کی طرح ٹھنڈک اور تاریک تھی۔ میرا جی چاہتا تھا میں اس گہرائی میں ڈوب جاؤں۔ مگر ان آنکھوں میں کچھ تھا جو میرے سوال کا ان کہا جواب تھا۔ چاہے میں لاکھوں برس کوشش کرتا رہوں۔ مریم مجھے قبول نہیں کرے گی۔ اُس گھڑی مجھے معلوم ہو گیا کہ میری تقدیر پہ مُہر لگ چکی ہے۔

وہ ہمہ تن سوال تھی۔ رنگین دھاگے اور مہندی کے رنگ سے سُرخ کلائی دائیں ہاتھ سے شاخ چھوڑ دی۔ میں نے ڈھلوان سے دوسری طرف جاتے ہوئے کہا "مریم مجھے تم سے کچھ نہیں کہنا تھا۔ تم جاؤ۔ مہمان عورتیں تمہارا انتظار کر رہی ہوں گی۔ شتیل تمہاری راہ دیکھ رہی ہو گی۔ تم جاؤ۔"

چیت بہار کا موسم تھا بستیاں آباد تھیں۔ میں اور بیرن سر جھکائے تیزی سے شہر کی طرف جا رہے تھے۔ مجھے عیسیٰ خاں کے مرنے کا غم بھی نہیں تھا۔ مجھے مریم کے

گانے توڑ کر سر پر خاک ڈال لینے کا بھی غم نہیں تھا۔ مجھے روہی کی گنوار لڑکی کے پاؤں تلے روندے جانے کا بھی غم نہیں تھا۔ بیاہ کے دن نکاح کی اس گھڑی جب میں گوپے میں ملگجے کپڑوں میں لپٹی مریم سے ملنے اور شادی کی رسمیں ادا کرنے گیا تھا اور باہر بلند خاں کی چیخ سن کر لوٹ آیا تھا لگا تھا جیسے کسی نے پھونک مار کر دیئے بجھا دئے ہوں۔

حدِ نظر تک تب سے ابتک دیئے بجھتے ہی چلے گئے ہوں۔

ہمیں سامان لادتے ہوئے صرف گاری خاں نے کہا تھا، "سائیں زندگی میں آدمی اتنی دفعہ ٹوٹتا ہے اتنی دفعہ کہ پھر اسے ٹوٹنے کا رنج نہیں ہوتا۔ وہ کرچیں سمیٹ کر ایک سے دوسری منزل کی طرف چلتا رہتا ہے۔ آدمی میں ٹوٹے ٹکڑوں کو جوڑنے کی ہمت آپ سے آپ آجاتی ہے۔

مجھے کسی شئے کا غم نہیں تھا۔ مگر میرے دل کے آسن پر ایک مورتی کی جگہ خالی ہو گئی تھی اور وہ مورتی میری اپنی تھی۔ آج تک میں نے اپنے آپ کو چاہا تھا۔ اپنے آپ کو عظیم جانا تھا۔ دل کے مندر میں مورتی بھی آپ ہی تھا اور پجاری بھی میں آپ ہی۔ صرف مریم کی آنکھوں نے میرے دل کے اندر جھانکا تھا اور اُسے معلوم تھا کہ وہاں اس کی کوئی جگہ نہ تھی۔

شہروں کی پُر شور بارونق مصروف زندگی میں مَیں نے کوشش کی ہے کہ میں دوسروں سے بازی گر کی طرح۔ اپنے آپ سے لاتعلقی در اصل اپنے سے

گہرے لگاؤ کی حامل رہی ہے۔ میں نے ایک بازیگر کی طرح اپنے آپ کو فنکار بنایا ہے۔ یہاں تک کہ مجھ پر بھی میری شعبدہ بازیاں اثر نہیں کر سکیں۔ میں نے ٹوٹی ہوئی مورتی کی کرچیں جوڑ کر انھیں مختلف روپ دئیے ہیں۔ پر آسن پر مندر میں وہی اکیلی مورتی رہی ہے ۔۔۔ "من یوم تجلی ہے"

کھڑکی میں سے روشنی آ رہی ہے۔ شاید پہاڑیوں کے پیچھے سورج بادلوں کی اوٹ سے نکل آیا ہے۔ نیچے کی وادیاں دھوپ سے روشن ہو رہی ہوں گی ابھی شیر دل آئے گا اور اسی محبت سے پوچھے گا۔

"بابا آپ نے رات خوب آرام سے گزاری"

میں صرف مسکرا دوں گا۔ اُسے یہ نہ بتا سکوں گا کہ رات میں نے کہاں گزاری ہے۔ مگر رات جو زندگی کی باقی راتوں کی طرح گزر ہی گئی۔